

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

بے شک اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں  
(حدیث)

# معاشرتی آداب و اخلاق

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

تألیف:

خلیق احمد مفتی

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ  
بے شک مجھے اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں  
(حدیث)

# معاشرتی آداب و اخلاق

## اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

تألیف:

خلیق احمد مفتی

ناشر:

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب : معاشرتی آداب و اخلاق  
طبع : اول  
تالیف : خلیق احمد مفتی  
ناشر :

..... ﴿ رابطہ ﴾ .....

پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحدہ عرب امارات -

khaleeqmufti@hotmail.com



فہرست مضامین

صفحہ :	عنوان :
۵	حرف آغاز
	☆ انسان اور معاشرہ :
۱۰	انسان کیلئے معاشرے کی ضرورت و احتیاج
	☆ اسلام اور معاشرہ :
۱۴	اسلامی معاشرے کے امتیازی اوصاف
۵۱	آفاقی نظام
۱۶	مساوات
۲۲	فضیلت کا معیار: تقویٰ
۲۸	اسلامی اخوت و اتحاد کی بنیاد: لا الہ الا اللہ
	☆ اسلامی معاشرہ اور حسن اخلاق :
۳۶	حسن اخلاق کی اہمیت
۴۲	ارکان اسلام اور اخلاقی تعلیم
۴۶	اخلاقی کمزوری ایمانی کمزوری کی علامت ہے
۵۰	صدق
۶۱	امانت و دیانت
۷۴	ایفائے عہد

صفحہ :	عنوان :
۸۲	عدل و انصاف
۹۸	رحمدلی و مہربانی
۱۱۰	حسد؛ بدترین خصلت
۱۳۰	زبان کی حفاظت
۱۵۵	تکبر سے اجتناب
۱۶۳	غصہ؛ دین و دنیا کا خسارہ
۱۷۲	صبر؛ دنیا و آخرت میں کامیابی کا راز
۱۸۴	شکرگزاری؛ مؤمن کی خاص صفت
۲۰۲	شرم و حیا
۲۰۷	اعتدال

### ☆ اسلامی معاشرہ اور حقوق العباد :

۲۲۶	والدین کا مقام و مرتبہ
۱۴۲	اولاد؛ ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر کس طرح؟
۲۵۴	زوجین کے حقوق و فرائض
۲۶۵	قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک
۲۷۰-۲۶۸	پڑوسی کا احترام



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## حرفِ آغاز:

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين ، نبينا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد :

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اس کی جسمانی و فطری ضروریات کی تکمیل کیلئے وسائل مہیا فرمائے، اسے خیر و شر میں فرق کرنے کی صلاحیت، عقل، اور ضمیر کی آواز عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ اس کی کامل رہنمائی کی غرض سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ ان انبیائے کرام علیہم السلام کے مقاصدِ بعثت میں ”مکارمِ اخلاق“ کی تعلیم اور ”رذائلِ اخلاق“ سے مکمل اجتناب کی تاکید و تلقین بھی شامل تھی۔

چنانچہ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۱) ترجمہ: (پیشک اللہ نے مومنین پر بڑی احسان فرمایا کہ انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا، جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، یقیناً یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)

اس آیت میں: وَيُزَكِّيهِمْ سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ آپ ﷺ کے فرائض منصبی

نیز آپ کے مقاصدِ بعثت میں ”تزکیہٴ نفوس“ بھی شامل ہے، یعنی آپ ﷺ کو اللہ کے حکم سے انسانی معاشرے کو کفر و شرک، معصیت و ضلالت، نیز تمام اخلاقِ رذیلہ سے پاک و صاف فرمادینے کی غرض سے مبعوث فرمایا گیا، جیسا کہ خود آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

(إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ) (۱) ترجمہ: (بے شک مجھے اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کیلئے عقائد و نظریات کی درستی و سلامتی کے ساتھ افکار و خیالات اور اخلاق و کردار کی بلندی و شانستگی بھی ضروری و لازمی ہے، کیونکہ انسان محض گوشت پوست کے اس ظاہری وجود کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل چیز تو اس کی انسانیت، شرافت، نجابت اور اخلاق و کردار ہے۔

آج کے اس دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں تیز رفتاری، خصوصاً اتصالات و مواصلات کی برق رفتار ترقی نے اگرچہ یقیناً انسانیت کی خدمت کے معاملے میں مثبت کردار ادا کیا ہے، لیکن اس تلخ حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ معاشرے پر اس کے منفی نتائج و اثرات کی چھاپ بھی بہت گہری ہے، اور اس کے برے اثرات نہایت سرعت کے ساتھ ذہنوں میں اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انتہائی نازک، قابلِ تشویش اور حساس ترین پہلو یہ ہے کہ اس منفی صورتِ حال کی بدولت معاشرے میں تیزی کے ساتھ ”اخلاقی اقدار“ کے معیار تبدیل ہونے لگے ہیں، خیر و شر کے پیمانے بدل رہے ہیں.....!

تیزی سے بدلتے ہوئے ان رجحانات، کروٹ بدلتے ہوئے ان حالات، اور چہار سو مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی یلغار کے اس پر آشوب دور میں امتِ مسلمہ کو عموماً اور نوجوان نسل کو

(۱) مجمع الزوائد (بحوالہ: بزار، باب فی حسن خلقہ و حیاءہ و حسن معاشرتہ) ج: ۹، ص: ۱۵۔

خصوصاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر فرمودہ اخلاقی اقدار اور اس سلسلہ میں دین اسلام کی تابندہ و درخشاں تعلیمات سے منسلک و وابستہ رکھنے کی حسرت و تمناء میں لئے ہوئے ”معاشرتی آداب و اخلاق“ کے نام سے یہ معمولی سی تحریر اپنے دینی بھائیوں کی خدمت میں اللہ کا نام لے کر پیش کر رہا ہوں اور رب کائنات کے حضور دست بدعاء ہوں کہ وہ میری اس حقیر سی کوشش کو اپنے خاص لطف و کرم سے شرف قبولیت سے نوازے، اور اسے میرے لئے، نیز میرے والدین، اہل و عیال، ذوی الارحام، اساتذہ کرام، اور ہر اس شخص کیلئے ذخیرہ آخرت بنا دے جس نے کسی بھی شکل میں اس کی طباعت و اشاعت میں تعاون کیا ہو۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین ۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین ۔

خلیق احمد مفتی

۲۵/ ذوالحجہ ۱۴۲۷ھ، مطابق ۱۵/ جنوری ۲۰۰۷ء بروز پیر۔

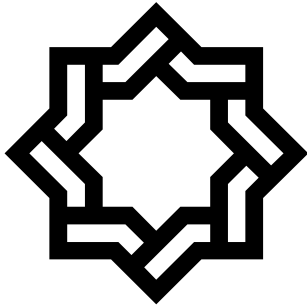
پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحدہ عرب امارات ۔

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti







# انسان

اور

# معاشرہ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## انسان کیلئے معاشرے کی ضرورت و احتیاج

انسان ”اُنس“ سے مأخوذ ہے، جس کا لفظی معنی ہے ”مانوس“ ہونا، لہذا لفظ: ”انسان“ کے معنی ہوئے: ”مانوس ہونے والا“۔ (۱)

”انسان“ کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ وہ پیدائشی فطری طور پر ہی ”مدنی الطبع“ اور مانوس ہونے والا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ انسانی آبادی کے درمیان، نیز دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے، انسانی آبادی سے دور کسی ویران و بیابان اور الگ تھلگ مقام پر تنہا زندگی گزارنا اس کیلئے ممکن نہیں، اسے تنہائی سے وحشت محسوس ہوتی ہے، اس کیلئے تنہائی یقیناً بہت بڑا اور ناقابل برداشت عذاب ہے، تنہائی کا شکار انسان بسا اوقات ایسے جسمانی و نفسیاتی و اخلاقی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اس کی صحت و سلامتی کیلئے مہلک و تباہ کن اور زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں، اسی لئے جیلوں اور قید خانوں میں ”قید تنہائی“ کو انتہائی تکلیف دہ اور شدید ترین قید تصور کیا جاتا ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان مدنی الطبع ہے، انسانی آبادی سے دور رہنا اس کیلئے ممکن نہیں، تو اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اپنی اسی فطری و طبعی جبلت اور اسی مزاج کی وجہ سے بہت سے انسان جب باہم مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے اس عمل کے نتیجے میں ”انسانی معاشرہ“ وجود میں آتا ہے۔

خالق کائنات نے اس انسانی معاشرے کے ارتقاء اور اس کی بقاء و دوام کی غرض سے ایسا

(۱) ”اُنس“ اور ”انیس“ کے بھی یہی معنی ہیں، یعنی ”مانوس“ ہونے والا۔

قدرتی نظام وضع فرما دیا ہے جس کی وجہ سے انسانی معاشرے کے ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں دوسرے کی ضرورت و احتیاج ہے، گویا ہر انسان کی سلامتی و بقاء کا انحصار کسی نہ کسی درجہ میں دوسرے انسانوں کی سلامتی و بقاء پر ہے، اور ان سب ہی کے مفادات و مصالح باہم پیوستہ ہیں، خواہ ان میں آپس میں والدین اور اولاد کا رشتہ ہو، وہ میاں بیوی ہوں، قرابت دار ہوں، پڑوسی ہوں، خادم و مخدوم یا حاکم و مملوم ہوں، یا خریدار اور دکاندار کے باہمی معاملات ہوں.....! قدرت کا وضع کردہ ”بقائے باہمی“ کا یہ اصول ہمیشہ اور ہر جگہ کارفرما نظر آئے گا۔

”بقائے باہمی“ کے اسی اصول کا لازمی و منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ہر فرد کے ذمے کچھ ”فرائض و واجبات“ ہیں، نیز اسی طرح اس کے کچھ ”حقوق“ ہیں۔ ایسی صورت حال میں یہ بنیادی اصول ہمیشہ ہر انسان کے پیش نظر رہنا چاہئے کہ پہلے مکمل خلوص، محنت، لگن اور امانت و دیانت کے ساتھ ”فرائض و واجبات“ کی ادائیگی کا اہتمام و التزام ہو، اس کے بعد ”حقوق“ کی وصولی کی خواہش و امید رکھی جائے، پہلے خوب دل لگا کر محنت و کوشش کی جائے اور اپنا فرض ادا کیا جائے، اس کے بعد معاوضے کی وصولی کی امید رکھی جائے (۱) معاشرے کا ہر فرد جب اس بنیادی اصول پر مکمل ثابت قدمی کے ساتھ کاربند رہے گا تب ہی معاشرے میں امن و امان اور سکون و اطمینان کی فضاء قائم ہو سکے گی، اور معاشرہ بخیر و عافیت ترقی و خوبی اور خوشحالی و سلامتی کی شاہراہ پر گامزن رہ سکے گا۔

لیکن اگر اس کے برعکس واجبات کی ادائیگی کی تو کوئی فکر نہو، اپنی ذمے داریوں سے جی چرایا جائے یا دامن چھڑانے کی کوشش کی جائے..... مگر حقوق کی وصولی کے معاملہ میں بڑی

(۱) جیسا کہ مشہور محاورہ ہے: First deserve then desire.

پھرتی و مستعدی، بے چینی و بے صبری، ہمت و کوشش اور خوب جوش و خروش اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا جائے.....! تو یقیناً ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جائے گا، ترقی و کامیابی اور خوشحالی کی بجائے معاشرہ زوال و انحطاط کا شکار ہو جائے گا، اوریوں بالآخر رفتہ رفتہ انسانی معاشرے کی عمارت زمین بوس ہو کر رہے گی۔



# اسلام اور معاشرہ



## اسلامی معاشرے کے امتیازی اوصاف

---

### (۱) آفاقی نظام:

انسان ”فطری“ طور پر مدنی الطبع ہے، اور اسلام بھی ”دین فطرت“ ہے۔ لہذا انسانی معاشرت اور اس بارے میں حقوق و فرائض یا معاشرتی آداب و اخلاق کا جب بھی تذکرہ ہوگا تو یقیناً اسلام کی ”معاشرتی تعلیمات“ کو ہی ہمیشہ بنیادی حیثیت و اہمیت حاصل رہے گی، کیونکہ اسلامی تعلیمات تو آسمانی و آفاقی ہیں، جن کی اساس کسی انسان کے افکار و خیالات یا اس کے وضع کردہ اصول و نظریات پر نہیں، بلکہ یہ تعلیمات انسان کے رب اور اس کے خالق و مالک کی طرف سے نازل فرمودہ ہیں، جو انسان کے نفع و نقصان کو خود انسان سے بھی بڑھ کر جانتا ہے، کیونکہ وہ خالق ہے اور انسان اس کی مخلوق ہے، خالق کا علم کامل، جبکہ مخلوق کا علم ناقص ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے)

مزید یہ کہ جس اللہ نے اپنی قدرت و مشیت سے انسان کو پیدا کیا ہے، یقیناً انسان کیلئے مصالح و مفاسد اور اس کے نفع و نقصان کے بارے میں بھی اسے مکمل اور قطعی و یقینی علم ہے، کیونکہ اس بات کا تو تصور بھی محال ہے کہ خالق کو اپنی ہی مخلوق کے نفع و نقصان کے بارے میں علم و آگاہی نہ ہو، اور پھر اللہ تو علیم وخبیر اور سمیع و بصیر ہے، اور وہ تو انسان کی شر و رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہے!.....

معاشرتی آداب و اخلاق (۱۵) اسلامی معاشرے کے امتیازی اوصاف

---

اسی حقیقت کی طرف اس ارشادِ ربانی میں اشارہ ہے: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (۱) ترجمہ: (کیا وہی نہ جانے جس نے پیدا کیا؟ جبکہ وہ تو باریک بین اور باخبر بھی ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (۲) ترجمہ: (ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں ان سے ہم واقف ہیں، اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں)

لہذا عقلِ سلیم اس حقیقت کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اسلام کی معاشرتی تعلیمات ہی انسانی معاشرے کی صلاح و فلاح کی ضامن، نیز اس کی ترقی و خوبی کیلئے مشعلِ راہ اور اس کی سلامتی، اس کی بقاء اور اس کے دوام کیلئے مضبوط و مستحکم بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں، کیونکہ یہ آسمانی و آفاقی، بلکہ ”ربانی“ تعلیمات ہیں کہ جن کی بنیاد عقیدہ و ایمان پر ہے۔

(۲) مساوات: (یعنی: لسانی، نسلی و طبقاتی تقسیم سے پاک معاشرہ):

---

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ (۳) ترجمہ: (اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے، جس نے تمہیں پیدا کیا ایک ہی جان سے، اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں سے پھیلا دیا بہت سے مردوں اور عورتوں کو)

اس آیت میں تمام انسانوں کو ان کے پروردگار اور ان کے خالق و مالک کی طرف سے

---



”خوفِ خدا“ کو اپنا شیوہ و شعار بنانے کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی انہیں یہ تاکید و تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان سب کو ایک ہی ماں باپ، یعنی آدم و حوا سے پیدا کیا ہے، لہذا انسانیت کے لحاظ سے تمام انسان برابر ہیں، رنگ و نسل، حسب و نسب، مال و دولت، جاہ و حشمت، حسن و جمال، زبان و بیان، قوم و قبیلہ، برادری اور ذات، نیز علاقے یا صوبے کی بنیاد پر انسانوں میں باہم امتیاز اور تفریق و تقسیم کی ہر گز ہرگز اجازت نہیں ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَ أَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ﴾ (۱) ترجمہ: (یقیناً یہ تمہاری امت [صرف] ایک ہی امت ہے، اور میں ہی تمہارا رب ہوں، سو میری ہی عبادت کرو)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَى إِلَى عَصَبِيَّةٍ ، لَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ ، لَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ) (۲) ترجمہ: (وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے عصیت کی طرف بلایا، وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے عصیت کی بناء پر جھگڑا کیا [یا جنگ لڑی]، وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے عصیت کی بناء پر جان دے دی) (۳)

نیز ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (النَّاسُ بَنُو آدَمَ ، وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ) (۴) ترجمہ: (تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں)

(۱) الانبیاء [۹۲] (۲) ابوداؤد [۵۱۲۱]

(۳) یعنی عصیت کی بناء پر لڑتا ہوا مارا گیا۔ ”عصیت“ سے مراد قومی و لسانی تعصب، نیز رنگ و نسل کی بنیاد پر روا رکھی جانے والی ہر تمیز اور تفریق و تقسیم ہے۔

(۴) ترمذی [۳۹۵۶] ابوداؤد [۵۱۱۶] باب التفاضل بحساب۔

حجۃ الوداع کے موقع آپ ﷺ نے جو یادگار خطبہ دیا، جو کہ قیامت تک تمام انسانیت کیلئے منشور اور دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے، اس خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا:

(يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَأَفْضَلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لَأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لَأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى، إِنْ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ) (۱)

ترجمہ: (اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، اور تمہارا باپ [آدم علیہ السلام] ایک ہے، خبردار! کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں، ہاں مگر ”تقویٰ“ کے ذریعے، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے)

اسی طرح فتح مکہ کے یادگار موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (النَّاسُ رَجُلَانِ: بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيمٌ عَلَى اللَّهِ، وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيْنٌ عَلَى اللَّهِ) (۲)

ترجمہ: (تمام انسانوں کی صرف دو ہی قسمیں ہیں، ایک: نیک اور متقی، جو اللہ کے نزدیک باعزت اور محترم ہے۔ دوسرا: فاجر و بد بخت، جو اللہ کے نزدیک حقیر و ذلیل ہے)

رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حضرات مہاجرین و انصار نیز اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بلال حبشی رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی موجود ہوتے تھے، ان میں باہم کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں تھی۔

☆..... خلیفہ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس

(۱) بیہقی۔ ملاحظہ ہو: الترغیب والترہیب [۴۳۹۴]

(۲) ابن ابی حاتم۔ تفسیر ابن کثیر میں إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ [سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳] کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

کے موقع پر مدینہ منورہ سے بیت المقدس کی طرف روانگی کے وقت اپنے غلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”دیکھو! اس ایک اونٹ پر ہم دونوں باری باری سوار ہوں گے.....!!“

کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ امیر المؤمنین اور خلیفہ المسلمین اپنے غلام سے یہ فرما رہے ہیں.....! اور پھر یہ کہ خلیفہ بھی کوئی معمولی نہیں، بلکہ ایسے عظیم الشان خلیفہ کہ جنہوں نے اپنے صرف دس سالہ دور حکومت میں جو علاقے فتح کئے ان کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل ہے۔ اس کے باوجود اپنے غلام کے ساتھ حسن سلوک کا یہ عالم ہے کہ کبھی خلیفہ اونٹ پر سوار ہیں اور غلام پیڈل چل رہا ہے، اور کبھی غلام اونٹ پر سوار ہے اور خلیفہ پیڈل سفر کر رہے ہیں.....!! انسانی مساوات کے سلسلے میں یقیناً دنیا ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

☆..... فتح مصر کے موقع پر اسلامی لشکر کے قائد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مقوقس شاہ مصر سے مذاکرات کی غرض سے ایک وفد ارسال کیا، اس وفد کا سربراہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ جب یہ وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا تو وہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر چلانے لگا: ”نَحْنُ عَنِّي هَذَا الْعَبْدَ الْأَسْوَدَ“، یعنی: ”اس سیاہ غلام کو میری نظروں سے دور ہٹاؤ“۔ جس پر وفد کے باقی ارکان نے مقوقس کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ چونکہ عبادہ ہمارے اس وفد کے سربراہ ہیں لہذا یہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے اور یہی آپ سے مذاکرات بھی کریں گے۔ اس پر مقوقس نے وفد کے ارکان سے مخاطب ہو کر کہا کہ: ”تم سب تو سفید فام ہو، پھر تم نے اس کا لے آدمی کو اپنا سربراہ کیوں بنا رکھا ہے.....؟ اس پر ان سب نے مقوقس

کو یہ جواب دیا کہ: ”ہم مسلمان ہیں، ہمارے مذہب میں چہروں کی سیاہی اور سفیدی کی کوئی حیثیت نہیں، ہمارے مذہب میں اصل چیز عمل کی سیاہی اور سفیدی ہے۔“

☆..... خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت کا واقعہ ہے کہ حج کے موقع پر جب مکہ مکرمہ میں حجاج کرام بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے تو انہیں مناسکِ حج سے متعلق مختلف مسائل دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، چنانچہ وہ مکہ مکرمہ میں موجود علمائے دین سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حجاج کرام کے قافلوں میں بھی علمائے دین کی بڑی تعداد موجود ہوا کرتی تھی، لوگ ان کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے بعض اوقات کسی ایک مسئلے میں ان علمائے کرام میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ اس پر خلیفہ نے یہ اعلانِ عام کروا دیا کہ ”حج کے موقع پر پورے مکہ میں تمام علماء میں سے صرف عطاء بن ابی رباح فتویٰ جاری کریں گے، ان کے سوا کسی کو اس کی اجازت نہیں ہوگی، لہذا تمام حجاج صرف عطاء بن ابی رباح سے ہی اپنے مسائل دریافت کریں۔“ حالانکہ یہ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تعالیٰ اگرچہ انتہائی جلیل القدر عالم، محدث، فقیہ، اور بلند پایہ متقی تو یقیناً تھے، مگر ان کی ظاہری صورت حال یہ تھی کہ: ”رنگت انتہائی سیاہ تھی، شکل و صورت بالکل ہی معمولی تھی، ایک آنکھ سے معذور تھے، ایک بازو مفلوج تھا، ایک ٹانگ سے لنگڑا تے تھے، اور جب اپنے ہزاروں شاگردوں کے درمیان بیٹھے ہوئے درسِ حدیث میں مشغول ہوتے تو اپنی شدید سیاہ رنگت کی وجہ سے دور سے دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے سفید کپاس کے کھیت میں کوئی کالا کوا میٹھا ہو..... (۱)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کو اس قدر معمولی شکل و صورت اور ان

(۱) مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: ”من رواقع حضارتننا فی التاریخ“ از: مصطفیٰ السباعی۔

تمام تر ظاہری و جسمانی عیوب و نقائص کے باوجود ”افتاء“ جیسی اہم ترین ذمہ داری؛ بلکہ اس عظیم ترین منصب اور اعلیٰ ترین شرف و اعزاز کیلئے منتخب کیا گیا اور خلیفہ وقت کے حکم پر یہ منادی کی گئی کہ موسم حج کے دوران پورے شہر مکہ میں ”افتاء“ کی اجازت صرف عطاء بن ابی رباح کو ہوگی.....! یقیناً یہ اسلام کی تعلیم مساوات ہی کا کرشمہ ہے۔

☆..... تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے نامور اور عظیم الشان بادشاہ ایسے گذرے ہیں کہ جو دراصل غلام تھے یا غلاموں کے خاندان سے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام کی تعلیم مساوات کی بدولت وہ تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ مثلاً مصر میں ”ممالیک مصر“ تاریخ میں مشہور ہیں، اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں ”خاندانِ غلاماں“ کی بڑی شہرت ہے، تختِ دہلی پر جلوہ افروز ہونے والے متعدد نامور بادشاہوں کا تعلق اسی خاندانِ غلاماں سے تھا، خصوصاً ان میں سے قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نیز اسلام کی اسی بے مثال تعلیم مساوات ہی کا کرشمہ ہے کہ امیر و غریب، بادشاہ و فقیر، مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد مسجد میں ایک ہی کعبے کی طرف رخ کئے ہوئے، ایک ہی امام کی اقتداء میں، اپنے ایک ہی رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ایک ہی صف میں نماز ادا کرتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز نیز حج بیت اللہ کے موقع پر مشرق و مغرب سے آنے والے مختلف زبانیں بولنے والے لاکھوں فرزندانِ توحید ایک ہی جیسے لباس میں ملبوس ہو کر ایک ہی کعبے کے گرد طواف میں مشغول ہوتے ہیں..... ان سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمات ہوتے ہیں (لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ

لَبَّيْكَ.....) یہاں تک کہ ان سب کی غرض و غایت، ان کی نیت و خواہش اور ان کا مطلوب و مقصود بھی صرف ایک ہی ہوا کرتا ہے، یعنی گناہوں سے مغفرت و معافی اور اپنے خالق و مالک کی رضامندی و خوشنودی کا حصول.....! ان کے حلیہ و لباس میں بھی یگانگت و مساوات، اعمال میں بھی یگانگت و مساوات، زبان پر جاری کلمات میں بھی یگانگت و مساوات، حتیٰ کہ نیتوں اور نصب العین میں بھی یگانگت و مساوات.....!!

اس سے بڑھ کر ”مساوات“ کی کوئی مثال پیش کرنے سے یہ دنیا یقیناً عاجز و قاصر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”اسلامی مساوات“ ایک ایسی انمول اور بے مثال نعمت ہے کہ جس کیلئے دوسرے مذاہب کے پیروکار ترستے ہیں اور مسلمانوں پر رشک کرتے ہیں۔

چنانچہ مشہور فرانسیسی فلسفی ”رینان“ کا قول ہے کہ: ”مجھے جب بھی مسلمانوں کی کسی مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا تو اُس موقع پر ہمیشہ ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی اور میں نے اپنے دل میں یہ حسرت محسوس کی کہ کاش میں بھی مسلمان ہوتا۔“

اسی طرح مشہور و معروف فلسفی پروفیسر آرنلڈ نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ: ”میں وہ منظر کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب میں نے ہندوستان میں دہلی کی جامع مسجد میں ہزاروں مسلمانوں کو ماہِ رمضان کے آخری جمعہ (جمعة الوداع) کے موقع پر انتہائی خشوع و خضوع کی کیفیت میں نمازِ جمعہ ادا کرتے دیکھا، نماز کے دوران ان کی ایک ایک حرکت سے اللہ کے سامنے انتہائی عجز و انکسار کا اظہار ہو رہا تھا، اور یہ منظر ہر دیکھنے والے کے شعور و وجدان میں پیوست ہوتا چلا جا رہا تھا.....!“ (۱)

(۱) مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: العبادۃ فی الاسلام - از: یوسف القرضاوی۔

نیز: الاسلام؛ اثرہ فی الحصارۃ و فضلہ علی الانسانیۃ - از: ابوالحسن علی الندوی۔

### (۳) فضیلت کا معیار: ”تقویٰ“:

ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (۱) ترجمہ: (اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے اور ہم نے تمہیں بنادیا ہے قومیں اور قبیلے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ ہر ہیزگار ہے، بے شک اللہ خوب جاننے والا باخبر ہے)

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے تمام انسانوں کو مساوات کی تعلیم دیتے ہوئے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم سب انسانوں کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت یعنی آدم و حوا علیہما السلام سے پیدا فرمایا ہے تو پھر اپنے حسب و نسب پر فخر و غرور کرنا اور دوسروں کو حقیر و کمتر سمجھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یعنی جب تمام انسانوں کی اصل ایک ہی ہے اور وہ سب ایک ہی ماں باپ کی نسل ہیں تو پھر ان میں کسی تفریق اور اونچ نیچ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور یہ جو اللہ نے انسانوں کو مختلف قبیلوں، قوموں اور خاندانوں میں تقسیم فرمایا ہے، یہ تو محض اس لئے ہے کہ تمہیں باہم ایک دوسرے کو پہچاننے میں سہولت رہے، یعنی یہ تقسیم ہر گز ہرگز تفاخر کیلئے نہیں، بلکہ یہ تو محض تعارف کی غرض سے ہے۔

اور جہاں تک عزت اور فرقِ مراتب کا تعلق ہے تو اس کیلئے پیمانہ اور معیار صرف اور صرف ”تقویٰ“ ہے۔

معاشرتی آداب و اخلاق (۲۳) اسلامی معاشرے کے امتیازی اوصاف

یعنی اسلام میں شرافت و عظمت اور عزت کا تاج اسی کو عطاء کیا گیا ہے جس کے دل میں خوفِ خدا ہو، چنانچہ جو شخص جس قدر متقی ہوگا اور جس قدر بہتر اخلاق اور عمل و کردار کا مالک ہوگا اللہ کے نزدیک وہ اسی قدر باعزت ہوگا، خواہ وہ کوئی امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر، آقا ہو یا غلام، کالا ہو یا گورا، اور خواہ اس کا تعلق کسی بھی قوم، کسی بھی ذات اور کسی بھی ملک یا علاقے سے ہو.....!

قیامت کے روز کسی انسان سے اس کی قوم، برادری، زبان، اور حسب نسب کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، وہاں کی دائمی اور حقیقی کامیابی، عزت، اور راحت کا تمام تر انحصار اور دار و مدار صرف اور صرف تقویٰ و عملِ صالح پر ہے، باقی کسی چیز کی قطعاً کوئی حیثیت و اہمیت نہیں ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَ نَارٌ حَامِيَةٌ﴾ (۱) ترجمہ (تو جس کا [نیکوں کا] پلہ بھاری ہوگا وہ دل پسند زندگی میں ہوگا، اور جس کا [نیکوں کا] پلہ ہلکا ہوگا اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔ اور تم کیا جانو وہ [ہاویہ] کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ ہے)

لہذا اسلام میں فرقِ مراتب اور عزت و ذلت کیلئے معیار صرف تقویٰ و عملِ صالح ہے، مال، دولت، رنگ و نسل یا حسب نسب کا اس چیز سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۴) اخوت و اتحاد:

ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (۲) ترجمہ: (بے شک تمام مومن آپس



میں بھائی بھائی ہیں)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ (۱)  
ترجمہ: (ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں)  
یعنی تمام اہل ایمان خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں، ان کی شان اور ان کا شیوہ یہ ہے کہ وہ  
باہم ایک دوسرے کے خیر خواہ، مددگار، مخلص اور سچے ہمدرد ہیں۔

نیز ارشاد ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ  
بَيْنَهُمْ﴾ (۲) ترجمہ: (محمد ﷺ تو اللہ کے رسول ہیں، اور وہ جو ان کے ساتھ ہیں  
کافروں کے مقابلے میں سخت، جبکہ آپس میں مہربان ہیں)

اس آیت میں اگرچہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف و فضائل کا  
بیان ہے، مگر اس سے امت کے تمام افراد کو ان صحابہ کرام کے اتباع اور ان کے اوصاف  
اور عادات و خصائل کو اپنانے کی ترغیب بھی مقصود ہے۔ لہذا حضرات صحابہ کرام کی طرح  
تمام اہل ایمان کی یہی کیفیت ہونی چاہئے کہ وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں  
ایک دوسرے کیلئے نرم، مہربان، ہمدرد اور غمخوار ہوں۔

اسی طرح ارشادِ باری ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (۳)  
ترجمہ: (اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ کرو)

اس آیت میں اللہ کی رسی سے مراد دین اسلام ہے اور تمام مسلمانوں کو اس بات کا حکم دیا گیا  
ہے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو فراموش کر کے پوری طرح اسلام کی مقدس تعلیمات پر  
کار بند اور عمل پیرا ہو جائیں، ان سب کا یہی نصب العین، یہی مقصدِ حیات، اور یہی دستور

زندگی ہو۔ اور جب تمام مسلمانوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات ایک ہوگا تو ان میں باہمی افتراق و انتشار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور اس طرح مسلمان ایک مضبوط اور باوقار ملت بن سکیں گے۔

نیز ارشاد ہے: ﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی، اور آپس میں جھگڑانہ کرو) اگر جھگڑا کرو گے تو تم ناکام ہو جاؤ گے اور تمہارا رعب جاتا رہے گا۔ اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

اس آیت میں اہل ایمان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات اور ذاتی مفادات کو نظر انداز کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شیوہ و شعار بنائیں، ورنہ بصورتِ دیگر وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے، ناکامی و بربادی ان کا مقدر بنے گی، نیز دشمنوں کے دل سے ان کا رعب اور خوف جاتا رہے گا، کیونکہ دنیا و آخرت میں صلاح و فلاح، عزت و شوکت، کامیابی و کامرانی اور ترقی کا راز باہمی اخوت و محبت اور اتفاق و اتحاد میں ہی پوشیدہ ہے، جبکہ اس کے برعکس باہمی اختلاف اور افتراق و انتشار میں ناکامی و بربادی اور ذلت و رسوائی کا سامان ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادُّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَّى) (۲) ترجمہ: (باہمی محبت و مہربانی اور ہمدردی کے لحاظ سے مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی مانند ہے کہ جب اس [ایک جسم] کے کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کی

وجہ سے تمام جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے)  
یعنی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر مسلمان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھیں اور حتیٰ الامکان اس کے ساتھ تعاون کریں، خواہ بظاہر اس کے ساتھ ہمارا کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو۔

نیز ارشاد نبویؐ ہے: (كُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا) (۱) ترجمہ: (اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ)

نیز ارشاد ہے: (الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا) (۲)  
ترجمہ: (ہر مؤمن دوسرے مؤمن کیلئے ایک عمارت کی مانند ہے کہ اُس [عمارت] کا ہر حصہ دوسرے حصے کیلئے سہارا ہوتا ہے)

نیز ارشاد ہے: (الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ) (۳)  
ترجمہ: (ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ کبھی اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی مشکل وقت میں اسے تنہا چھوڑ دیتا ہے)

نیز ارشاد ہے: (لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّهُ لِنَفْسِهِ) (۴)  
ترجمہ: (تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ اپنے [مؤمن] بھائی کیلئے بھی اسی چیز کو پسند کرنے لگے جسے وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے)

مذکورہ آیات و احادیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح و ثابت ہو جاتی ہے کہ دین اسلام

(۱) بخاری [۵۷۱۷] باب ما بُعِثَ عَنْ التَّحْسُدِ وَالْتِدَابِ - نیز مسلم [۲۵۵۹]

(۲) بخاری [۴۶۷۷] [۲۳۱۴] [۵۶۸۰] مسلم [۲۵۸۵]

(۳) بخاری [۲۳۱۰] [۶۵۵۱] مسلم [۲۵۸۰]

(۴) بخاری [۱۳] مسلم [۴۵]

میں اُخوت و اتحاد کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس جذبہ اُخوت و اتحاد کو برقرار اور قائم و دائم رکھنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

خصوصاً جبکہ آج کے اس مہذب دور میں دنیا کی تمام اقوام و ملل پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ ہر قسم کی ترقی و بہتری اور خوشحالی و آسودگی کیلئے امن و امان، استقرار و استحکام اور اتفاق و اتحاد انتہائی ناگزیر ہے، اسی لئے آج کے اس جدید دور میں فاصلوں کو سمیٹنے اور قربتیں بڑھانے کی بتکلف ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے، بلکہ اس سلسلے میں مختلف اقوامِ عالم کے درمیان مسابقت زوروں پر ہے۔

لہذا بحیثیت مسلمان ہمیں تو اس اتفاق و اتحاد کو قائم و دائم رکھنے کی اور زیادہ فکر اور کوشش و جستجو کرنی چاہئے، کیونکہ یہ چیز تو ہمارے دین کا حصہ اور ہمارے مذہب کا تقاضا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان جب متحد تھے اُس وقت وہ دنیا کی سب سے زیادہ باعزت اور کامیاب قوم تھے، وہ ناقابلِ تسخیر قلعے کی مانند تھے، محدود وسائل کے باوجود انہوں نے مشرق و مغرب میں اللہ کا نام بلند کیا، حق کا بول بالا کیا، فتح و نصرت کے جھنڈے لہرائے، ان کے گھوڑے کبھی دجلہ و فرات، کبھی جیحون اور سیحون اور کبھی گنگا اور جمنا کا پانی پیتے رہے، ہمیشہ ہر میدان میں کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے.....!!

لیکن اس کے بعد جب ان میں رفتہ رفتہ اتفاق و اتحاد اور اخلاص و ایثار کی بجائے افتراق و انتشار اور خود غرضی و مصلحت پرستی جیسی مذموم خصلتیں پیدا ہونے لگیں تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی تمام عزت و عظمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کاش آج ہم نوشتہ دیوار پڑھ سکیں اور اس بات کو سمجھ سکیں کہ آج ہم مسلمان ذلت و رسوائی کے جس عذاب میں مبتلا ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کیلئے باہمی اتحاد و اتفاق ہمارے لئے ناگزیر ہے، یہی وقت کی پکار ہے، یہی

حالات کا تقاضا ہے، بلکہ یہی ہمارے دین کی تعلیم ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

### (۴) اسلامی اخوت کی بنیاد: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“

ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (۱) ترجمہ: (بے شک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں)

دین اسلام میں لسانی، نسلی، علاقائی، یا طبقاتی تقسیم یا اونچ نیچ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، لہذا اسلام میں لسانی، علاقائی یا رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی گروہ بندی یا کوئی رشتہ استوار کرنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے مطابق حقیقی رشتہ صرف اور صرف ایمان کا رشتہ ہے، دنیا کے تمام مسلمان اسی بے مثال اور لازوال رشتے میں منسلک ہیں، رنگ و نسل کے ظاہری فرق کے باوجود وہ سب آپس میں بھائی بھائی اور ایک دوسرے کے ہمدرد و ہمسایہ ہیں، ان کے اس ایمانی رشتے کی راہ میں جغرافیائی رکاوٹیں اور مشرق و مغرب کے فاصلے حائل نہیں ہو سکتے، ان ظاہری رکاوٹوں، دوریوں، اور فاصلوں کے باوجود ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں، ان کا رب ایک ہے، رسول ایک ہے، قرآن ایک ہے، کعبہ ایک ہے، مقصدِ حیات ایک ہے، عقیدہ و ایمان ایک ہے، اسی لئے اس ایمانی رشتے کے سوا دنیا کے باقی تمام رشتے بے کار و بے معنی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی مبارک مجلس میں جہاں حضرت ابو بکر و عمرؓ نیز دیگر اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف فرما ہوتے تھے وہاں ان کے درمیان بلال حبشی رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور صہیب رومی رضی اللہ عنہ بھی موجود ہوتے تھے، رنگ و نسل اور زبان

کے اس ظاہری فرق کے باوجود ان میں باہم کوئی تفریق یا اونچ نیچ نہیں تھی، وہ سب آپس میں شیر و شکر اور بھائی بھائی تھے، دل و جان سے ایک دوسرے کی عزت و تعظیم کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں وہ سب برابر تھے، ہم مرتبہ اور قابل احترام تھے، یہاں تک کہ خالق کائنات کی طرف سے ان سب کو یکساں طور پر آیت قرآنی: ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (۱) کے ذریعے دائمی خوشنودی و رضامندی کی خوشخبری سنائی گئی۔ جبکہ اس کے برعکس ابولہب عربی، قرشی، ہاشمی ہونے کے باوجود اعلیٰ حسب و نسب اور خاندانی جاہ و حشمت کے باوجود مال و دولت کی بہتات اور انتہائی حسن و جمال کے باوجود اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ سے قرابت داری کے باوجود..... وہ جہنمی قرار پایا، قیامت تک اہل ایمان قرآن کریم میں موجود یہ آیت پڑھتے رہیں گے: ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ.....﴾ (۲) یعنی: ”ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی ہلاک ہو جائے، نہ تو اس کا مال اس کے کسی کام آیا اور نہ ہی اس کی کمائی.....“۔

اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا دولت ایمانی سے محرومی کے سبب طوفان میں غرق ہو جانے والوں میں شامل تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں اس بارے میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ (۳)

غرضیکہ اللہ اور رسول ﷺ کی نظر میں اصل رشتہ صرف ایمان کا رشتہ ہے، جس کی بنیاد کلمہ: ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پر ہے۔ اگر یہ رشتہ ایمانی مضبوط و مستحکم ہو تو مشرق و مغرب کے یہ فاصلے مسلمانوں کے دلوں میں کوئی فاصلہ پیدا نہیں کر سکتے۔ اور اگر یہ رشتہ ایمانی

(۲) المسد [۱-۲]

(۱) المائدہ [۱۱۹] الجالدہ [۲۲] البیئہ [۸]

(۳) ملاحظہ ہو سورۃ ہود، آیات [۴۱-۴۹]

کمزور پڑ جائے تو پھر تہمتا مقرر بتیں بے کار اور بے معنی ہیں، تہمتا ظاہری قربتوں کے باوجود دلوں میں فاصلے ہوں گے، دوریاں ہوں گی، نفرتیں اور بیزاریاں ہوں گی، اور وہ ارشادِ ربانی: ﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى﴾ (۱) کا مصداق بن جائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ جب اللہ کے حکم سے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں آپؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان رشتہٴ مَوَاحَات قائم فرمایا، یہ بات قابلِ غور ہے کہ مہاجرین و انصار میں اس سے قبل بظاہر کسی قسم کا کوئی رشتہ اور تعلق نہیں تھا، وہ آپس میں ایک دوسرے کیلئے اجنبی تھے، لیکن اس کے باوجود اس رشتہٴ ایمانی کی بدولت ان میں باہمی اخوت و محبت کا ایسا مضبوط تعلق اور مستحکم رشتہ قائم ہو گیا کہ تاریخِ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے، انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو نہ صرف اپنے شہر میں جگہ دی بلکہ انہیں اپنے مکانات میں آباد کیا، انہیں سرانگھوں پر بٹھایا، ان کیلئے اپنے گھروں کے اور ساتھ ہی اپنے دلوں کے بھی دروازے کھول دیئے، اپنے مال و دولت، زمین اور جائیداد میں انہیں حصہ دار بنایا، یہاں تک کہ مہاجرین کیلئے انصار کی طرف سے اس بے پناہ محبت و ہمدردی، اور خلوص و ایثار کی وجہ سے خالقِ ارض و سماء کی طرف سے قرآن کریم میں انصار کے اعلیٰ اخلاق، مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک اور ایثار کی تعریف کی گئی، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقِ شَحْنِ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۲)

ترجمہ: (اور وہ جنہوں نے اس گھر [یعنی مدینہ] میں اور ایمان میں ان [مہاجرین] سے

(۱) سورۃ الحشر [۱۴] یعنی: ”آپ انہیں متحد سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ان کے دل دراصل ایک دوسرے سے

پہلے جگہ بنالی ہے اور وہ اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے، بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو، [بات یہ ہے کہ] جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب و بامراد ہے)

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام سے قبل مدینہ منورہ میں (جس کا نام اُس وقت یثرب تھا) اوس اور خزرج نام کے دو مشہور قبیلے آباد تھے، ان دونوں قبیلوں میں عرصہ دراز سے باہم جنگ و جدال اور قتل و خون ریزی کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے.....! مگر جیسے ہی ان کا شہر مدینہ ”لا الہ الا اللہ“ کے نور سے جگمگایا اور ان کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن ہوئی تو وہ صدیوں کے باہمی جنگ و جدال کو یکسر فراموش کر کے ایمان کے لازوال اور مقدس رشتے میں منسلک ہو گئے اور باہم شیر و شکر ہو گئے، جن کی نفرت و عداوت ضرب المثل تھی، اب ان کا باہمی ایثار اور خلوص ضرب المثل بن گیا، اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

﴿وَاذْكُرُوا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءَ ۭ فَاَلْفَ بَيْنٍ قُلُوْبُكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰۤی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور یاد کرو اللہ کا احسان تم پر جبکہ تم تھے آپس میں دشمن، پھر اس [اللہ] نے الفت ڈال دی تمہارے دلوں میں، پس تم ہو گئے اس کے فضل سے بھائی بھائی، اور تم آگ کے ایک کنوئیں کے دہانے پر تھے، پھر اس نے تمہیں بچایا اُس سے، اسی طرح اللہ بیان فرماتا ہے تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم



ہدایت حاصل کر سکو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (۱)  
ترجمہ: (اور اسی [اللہ] نے ان کے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی جو کچھ اس زمین میں ہے اگر تو وہ سارا سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا، یہ تو اللہ ہی نے ان میں الفت ڈال دی ہے، بے شک وہ غالب ہے حکمت والا ہے)

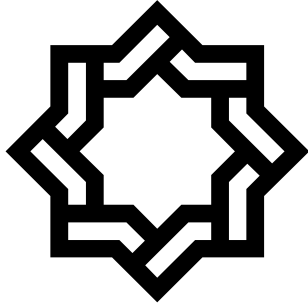
☆..... اور پھر یہ کہ اسلام نے باہمی اخوت و محبت کی محض تاکید و تلقین پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ مزید یہ کہ اس اخوت و محبت کا عملی سبق حاصل کرنے کی غرض سے اہل ایمان کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ روزانہ دن میں پانچ بار مسجد میں حاضر ہو کر باجماعت نماز کی ادائیگی کا اہتمام کریں تاکہ دنیا ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کی بنیاد پر قائم ہونے والی اس پاکیزہ اور بے مثال اخوت و محبت کا عملی مظاہرہ دیکھ سکے۔ دنیا یہ منظر دیکھ سکے کہ کس طرح امیر و غریب، حاکم و محکوم، آقا اور غلام، لالے اور گورے، سب ایک ہی کعبے کی طرف رخ کئے ہوئے ایک ہی امام کی اقتداء میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر ایک ہی رب کے سامنے انتہائی خشوع و خضوع کے عالم میں ”ایک نعبد وایک نستعین“ کا اقرار و اظہار کرتے ہیں۔

☆..... اسی رشتہ ایمانی کو مضبوط و مستحکم بنانے کی غرض سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا، تاکہ اسلامی معاشرے میں امراء و غرباء کے درمیان طبقاتی کشمکش اور باہمی نفرت و عداوت کی بجائے اخوت و محبت، باہمی احترام اور ایثار و ہمدردی کے جذبات میں ترقی و اضافہ ہو، اور یوں ملتِ اسلامیہ کے امراء و غرباء ایک دوسرے کے دست و بازو بن جائیں۔

☆..... اسی لازوال رشتہ ایمانی کا روح پرور نظارہ دنیا جج کے موقع پر دیکھتی ہے، جب مختلف رنگ و نسل، مختلف طبقات، اور مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے، مشرق و مغرب سے آنے والے لاکھوں فرزند ان توحید ایک ہی لباس یعنی احرام میں ملبوس ہوتے ہیں، ایک ہی گھر یعنی بیت اللہ کے طواف میں مشغول و منہمک ہوتے ہیں، ان سب کی زبان پر ایک ہی کلمات ہوتے ہیں یعنی ”لبیک اللہم لبیک“ اور وہ سب اپنے دلوں میں ایک ہی خواہش و تمنا لئے ہوئے دور دراز کے علاقوں سے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے وہاں پہنچتے ہیں، یعنی: اپنے رب کریم کی طرف سے مغفرت، نیز اس کی رضا مندی و خوشنودی کا حصول.....!

یقیناً اس ”رشتہ ایمانی“ جیسا لازوال اور بے مثال رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔





# اسلامی معاشرہ

اور

# حسنِ اخلاق



## حُسنِ اخلاق کی اہمیت:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۱)

ترجمہ: (یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے)

اس آیت کی رو سے ہر صاحبِ ایمان کیلئے یہ بات ضروری و لازمی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہستی کو اپنے لئے ”اُسوۂ حسنہ“ یعنی عمدہ نمونہ اور بہترین و قابلِ تقلید مثال تصور کرے اور آپ ﷺ کی تعلیمات اور احکام و ہدایات کی صدقِ دل سے تعمیل، نیز آپ ﷺ کے طور طریقوں اور اخلاق و عادات کو اپنانے کی مکمل اور مخلصانہ کوشش کرے۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و عادات کے بارے میں ادنیٰ غور و فکر اور تدبر و تتبع کرنے والے پر یہ بات بلاشبہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کی ہستی اور آپ کی تمام زندگی ”اخلاقِ حسنہ“ کا ایسا بہترین نمونہ تھی کہ تمام دنیائے انسانیت اس کی مثال پیش کرنے سے قطعاً و یقیناً عاجز و قاصر ہے۔

بیماروں کی تیمارداری، ہمسایوں و قرابت داروں کے حقوق کا پاس و لحاظ، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کی عزت، یتیموں اور بیواؤں کی امداد، بیکسوں اور کمزوروں کی دست گیری، ہر حالت میں حق گوئی و راست بازی، عدل و انصاف کے اصولوں کی ہر قیمت پر اور بہر صورت مکمل پاسداری، بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگزر اور رحم دلی و مہربانی کا سلوک ..... یہ تھا آپ ﷺ کا شیوہ و اخلاق۔ بلکہ آپ کی تعلیمات تو تڑپتی سکتی انسانیت کیلئے مسیحا، پیاسی زمین کیلئے ابرِ رحمت اور پتے ہوئے صحرا میں کسی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کی مانند تھیں

اسی لئے آپ ﷺ کو خالق ارض و سماء اور رب العالمین کی طرف سے ”رحمۃ للعالمین“ کے لقب سے نوازا گیا۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱)  
ترجمہ: (اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے)  
نیز قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق و عمدہ عادات و صفات کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (۲) ترجمہ: (اور بے شک آپ تو بہت بڑے [عمدہ] اخلاق پر ہیں)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۳) ترجمہ: (اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ بد زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، سو آپ ان سے درگزر کریں اور ان کیلئے استغفار کیا کریں اور کام کا مشورہ ان سے کیا کریں)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی ابتداء کے موقع پر جب غار حراء میں آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور اس موقع پر آپ ﷺ کو من جانب اللہ تبلیغ دین کا فریضہ سونپا گیا تو آپ ﷺ یہ سوچ کر انتہائی پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ میں یہ بارگراں کس طرح اٹھا سکوں گا، اور اس قدر عظیم فریضہ کس طرح انجام دے سکوں گا.....؟ اسی پریشانی اور شدت تفکیر کی وجہ سے آپ ﷺ کی طبیعت بھی ناساز ہو گئی، آخر اسی کیفیت میں آپ ﷺ گھر پہنچے، اپنی رفیقہ حیات ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے تمام ماجرا بیان فرمایا اور اسی

پریشانی کا اظہار کیا۔ جس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: (كَلَّا، وَاللَّهِ لَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ.....) (۱) ترجمہ: ”نہیں نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز اس کام میں رسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، مہمان نواز ہیں، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں، اور راہِ حق میں لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں“

غور طلب بات ہے کہ بعثت سے قبل ہی آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی و عظمت کا یہ حال تھا تو بعثت کے بعد کیا کیفیت ہوگی.....؟

اور پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے ہی اپنے اصحاب کو بھی ہمیشہ انہی اخلاقِ عالیہ و صفاتِ حمیدہ کو اپنانے کی تاکید و تلقین فرمائی، چنانچہ نجاشی شاہِ حبشہ نے جب دینِ اسلام کے بارے میں استفسار کیا تو اس موقع پر وہاں موجود مسلمانوں کی جماعت میں سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس طرح گویا ہے:

(أَيُّهَا الْمَلِكُ! كُنَّا قَوْمًا أَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ، نَعْبُدُ الْأَصْنَامَ، وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ، وَنُسَيِّئُ الْجَوَارَ، وَيَأْكُلُ الْقَوِيُّ مِنَّا الضَّعِيفَ، فَكُنَّا عَلَى ذَلِكَ حَتَّى بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْنَا رَسُولًا مِّنَّا، نَعْرِفُ نَسَبَهُ وَصَدَقَهُ وَأَمَانَتَهُ وَعَفَافَهُ، فَدَعَانَا إِلَى اللَّهِ لِنُوحِدَهُ وَنَعْبُدَهُ، وَنَخْلَعُ مَا كُنَّا نَحْنُ نَعْبُدُ وَآبَاؤُنَا مِنْ دُونِهِ مِنَ الْحَجَارَةِ وَالْأَوْثَانِ، وَأَمَرَنَا بِصَدَقِ الْحَدِيثِ وَأَدَاءِ الْأَمَانَةِ وَصَلَةِ الرَّحِمِ وَحَسَنِ الْجَوَارِ وَالْكَفِّ عَنِ الْمَحَارِمِ، وَنَهَانَا عَنِ الْفَوَاحِشِ وَقَوْلِ الزُّورِ

(۱) بخاری [۳] کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ

نیز: بخاری [۲۵۸۱] کتاب التعمیر - نیز: مسلم [۱۶۰]

وَأَكَلَ مَالِ الْيَتِيمِ وَقَذَفَ الْمُحْصَنَاتِ.....) (۱) ترجمہ: (اے بادشاہ! ہم جاہل تھے، بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، ہم میں سے جو طاقتور تھے وہ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اسی دوران اللہ نے ہم میں سے ہی ایک ہستی کو نبی بنا کر بھیجا، جس کی شرافت، خاندانی نجابت، امانت و دیانت اور راست بازی سے ہم بخوبی واقف تھے، اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی، ہم اور ہمارے باپ دادا اللہ کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو پوجتے چلے آ رہے تھے ان سے کنارہ کشی کی تاکید کی، اس نے ہمیں راست بازی، امانت و دیانت، صلہ رحمی، ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی و حسن سلوک کا حکم دیا، ہر قسم کی فحاشی و بے حیائی سے دامن بچانے، جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال دبا لینے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے باز رہنے کی تلقین کی.....)

یہ ہے اس اخلاقِ حسنہ کی ایک جھلک جس کی تاکید و تلقین رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں ہی فرمائی، اور پھر جس کی بدولت حق کی پکار پر لبیک کہنے والوں کی زندگیوں میں ایسا حیرتناک انقلاب برپا ہوا کہ وہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے ذلت کی پستیوں سے نکل کر عزت کی بلندیوں تک جا پہنچے، جو نہ صرف یہ کہ ان پڑھ تھے بلکہ اپنی جہالت پر انہیں فخر اور ناز تھا..... اب وہ دنیا بھر کے استاد، معلم و مربی اور تمام انسانیت کیلئے روشنی کا مینار بن گئے، صدیوں سے جہالت کے اندھیروں میں بھٹکنے والے اب ایک نئے دور کے مشعل بردار بن گئے، معمولی باتوں پر باہم قتل و خونریزی جن کا معمول بلکہ پسندیدہ ترین مشغلہ تھا اب وہ ہمدردی و ایثار کا نمونہ بن گئے، جن کی دشمنی ضرب المثل تھی اب ان کی اخوت و محبت دنیا بھر کیلئے مثال بن گئی، لوٹ مار جن کا شیوہ تھا اب وہ دوسروں کے ہمدرد اور

(۱) احمد [۱۷۴۰] حدیث جعفر بن ابی طالب و ہو حدیث ہجرۃ، نیز: احمد [۲۲۵۵۱] نیز: مجمع الزوائد عن الطبرانی۔



نغمہ ساز بن گئے، جن کی زندگی شراب نوشی، قمار بازی، اور لہو لعب میں بسر ہوئی تھی اب وہ رات کی خاموشیوں میں اللہ کے سامنے سر بسجود رہنے لگے.....!

اور پھر اس ابتدائی دور کے بعد بھی آپ ﷺ نے ہمیشہ حسن اخلاق کا سبق سکھایا اور اسی کی تاکید و تلقین فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ: (إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ) (۱) ترجمہ: (بے شک مجھے اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں) ☆..... اخلاقِ فاضلہ و صفاتِ حمیدہ کی تاکید و تلقین کے بارے میں چند احادیثِ مبارکہ

ملاحظہ ہوں:

☆ الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ (۲) ترجمہ: (صل نیکی تو حسنِ اخلاق ہے)

☆ إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا (۳) ترجمہ: (تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کا اخلاق عمدہ ہو)

☆ أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (۴) ترجمہ: (تمام اہل ایمان میں سے کامل ایمان والا شخص وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہو)

☆ مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ (۵) ترجمہ: (قیامت کے روز مؤمن کے تمام اعمال میں ”حسنِ اخلاق“ سے بڑھ کر وزنی اور کوئی عمل نہیں ہوگا)

(۱) مجمع الزوائد (بحوالہ: بزار، باب فی حسن خلقہ و حیاءہ و حسن معاشرتہ) ج: ۹، ص: ۱۵۔ یہی حدیث امام مالک نے موطا میں ان الفاظ کے ساتھ: (بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ) [نمبر: ۱۶۰۹] نیز: امام احمد نے مسند میں ان الفاظ کے ساتھ: (بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ) [نمبر: ۸۹۳۹] ذکر کر کے ہے۔

(۲) مسلم [۲۵۵۳] باب تفسیر البر والاثم (۳) بخاری [۳۳۶۶]

(۴) ابن حبان [۴۷۹] [۱۴۷۶] ترمذی [۲۶۱۲] باب ماجاء فی اکمال الایمان ..... (۵) ترمذی [۲۰۰۲]

☆ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ وَالْقَائِمِ (۱)  
ترجمہ: (مؤمن اپنے حسنِ اخلاق کی بدولت روزے دار اور نمازی کے مقام و مرتبے کو پالیتا ہے)

☆ إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبُكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا (۲) ترجمہ: (قیامت کے روز مجھے سب سے زیادہ محبوب اور مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جن کا اخلاق اچھا ہوگا)

☆ سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ ؟ قَالَ : (( تَقْوَى اللَّهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ )) . (۳) ترجمہ: (رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ: ”وہ کون سا عمل ہے جو دیگر تمام اعمال سے بڑھ کر انسانوں کیلئے جنت میں داخلہ کا سبب بنے گا؟ فرمایا: ”اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا خوف“ اور ”حسنِ اخلاق“۔)



(۱) ابوداؤد [۴۷۹۸] باب فی حسن الخلق۔

(۲) ترمذی [۲۰۱۸] باب ما جاء فی معالی الاخلاق۔

(۳) ترمذی [۲۰۰۴] ابن حبان [۴۷۶]۔

### ”ارکان اسلام“ اور ”اخلاقی تعلیم“:

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دین اسلام میں نہ صرف یہ کہ ”محاسن اخلاق“ کو اختیار کرنے اور ”ذائل اخلاق“ سے مکمل اجتناب کی تاکید و تلقین کی گئی ہے، بلکہ مزید یہ کہ اہم ترین اسلامی عبادات جن پر دین اسلام کی بنیاد ہے اور اسی وجہ سے جنہیں ”ارکان اسلام“ کہا جاتا ہے، ان عبادات میں بھی اخلاقی تعلیم و تربیت کا پہلو موجود ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان عبادات کے اسرار اور ان کے مقاصد نیز اغراض و غایات میں سے اہم ترین غرض و غایت اخلاقی تعلیم و تربیت ہی ہے۔

☆..... چنانچہ تمام اسلامی عبادات میں سب سے اہم ترین عبادت یعنی نماز سے متعلق آیات و احادیث میں اگر غور و فکر کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نماز سے اللہ کے ذکر، اور اس کی عبادت و اطاعت کے عملی اقرار و اظہار کے ساتھ ساتھ خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک، اخوت و مساوات، ہمدردی و ایثار اللہ کے بندوں کی مدد و اعانت، ان کیلئے نعمگساری و خیر سگالی کے جذبات کی نشو و نما اور ان میں ترقی و اضافہ بھی مقصود ہے، سورۃ الماعون کا یہی پیغام اور یہی مفہوم ہے۔

مزید یہ کہ نماز اخلاقی فاضلہ کی طرف رغبت و میلان کا وسیلہ، نیز اخلاقی رذیلہ و تمام فواحش و منکرات سے بندے کیلئے حفاظت و دوری کا ذریعہ بھی ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (۱) ترجمہ: (یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)

☆..... اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ (۱) ترجمہ: (آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے، جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک و صاف کر دیں، اور ان کیلئے دعاء کیجئے)

بلکہ زکوٰۃ کے توفیقی معنی ہی ”تزکیہ“ یعنی پاک کرنے کے ہیں، چنانچہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے ذریعہ وہ مال پاک و صاف اور مبارک ہو جاتا ہے کہ جس میں سے زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہو۔ نیز زکوٰۃ ادا کرنے والے کا دل مال و دولت کی محبت، حرص، طمع، ہوس، اور خود غرضی و نفس پرستی جیسے مہلک اور خطرناک ترین روحانی امراض اور انتہائی ناپسندیدہ فتنہ ترین عادات سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

مزید یہ کہ جس مسکین کو زکوٰۃ ادا کی گئی ہو اس کا دل احساسِ محرومی، اغنیاء و دولت مندوں کے خلاف حسد، نفرت و عداوت، اور بغض و کینہ جیسی بدترین صفات و عادات سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو بندگانِ خدا کے ساتھ خوش اخلاقی کا رویہ و سلوک اپنانے اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کو بھی ”صدقہ“ میں شمار فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: (تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ) (۲) ترجمہ: (اپنے بھائی [یعنی کسی مسلمان] کے ساتھ مسکرا کر پیش آنا بھی تمہارے لئے صدقہ ہے)

☆..... اسی طرح روزے سے مقصود محض چند گھنٹوں کیلئے کھانے پینے سے پرہیز ہرگز نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود اپنے نفس کو لگام دینا اور ہر برائی سے اجتناب کا عادی بنانا ہے، جیسا

کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلِ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ) (۱) ترجمہ: (جس کسی نے روزے کے دوران بھی جھوٹی بات اور جھوٹے کام کو نہ چھوڑا، تو اللہ کو بھی اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ایسا شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے رکھے) یعنی روزہ محض کھانے پینے سے پرہیز کا نام نہیں ہے، بلکہ روزے سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو جھوٹ و دیگر تمام منکرات و رذائل اخلاق سے ہمیشہ کیلئے مکمل اجتناب کا عادی بنائے۔

اسی طرح ارشاد نبویؐ ہے: (إِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمٍ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ ، فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ إِنِّي صَائِمٌ) (۲) ترجمہ: (تم میں سے جب کوئی روزے کی حالت میں ہو، تو کسی بے حیائی کا ارتکاب نہ کرے، اور نہ ہی جھگڑا کرے، اور اگر کوئی دوسرا شخص اسے برا کہے، یا اس سے لڑائی جھگڑا کرے تو [اس سے الجھنے کی بجائے] یوں کہے کہ: ”میں تو روزہ دار ہوں“۔)

علاوہ ازیں یہ کہ روزے کے دوران واقعی اور عملی طور پر بھوک اور پیاس کی تکلیف محسوس کرنے کے بعد روزے دار کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہونے لگتا ہے کہ وہ غریب اور مسکین جس کے پیٹ میں بھوک اور پیاس کی یہ آگ ہمیشہ ہی شعلہ زن رہتی ہے..... اس کی زندگی کس قدر تلخ ہوگی.....؟ چنانچہ اسی سوچ کی وجہ سے روزے دار کے قلب و ذہن میں احساس و شعور بیدار ہوتا ہے، اور اس کا دل غریبوں اور حاجت مندوں کیلئے ہمدردی و رحمہلی کے جذبات سے لبریز ہونے لگتا ہے، اور پھر یہی جذبات اسے ان حاجت مندوں کی مدد و اعانت پر آمادہ کرتے ہیں۔

(۱) بخاری [۱۸۰۴] باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم۔

(۲) بخاری [۱۸۰۵] باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم۔ ☆ مسلم [۱۱۵۱] ☆ احمد [۲۶۱۱۱]

☆..... اسی طرح حج بیت اللہ سے صرف سیر و تفریح یا محض کوئی سفر مقصود نہیں ہے، بلکہ اس اہم ترین عبادت سے بھی اصل مقصود تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق، اخوت و مساوات کے جذبات کی نشوونما، ایثار و قربانی، اور صبر و تحمل کی عادت اپنانے، نیز باہمی اختلافات، لڑائی جھگڑے، اور ہر قسم کے فسق و فجور اور بد عملی سے دامن بچائے رکھنے کی تاکید و تلقین ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (۱) ترجمہ: (جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے، اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بد عملی، اور کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ حَجَّ لِلَّهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ) (۲) ترجمہ: (جس شخص نے [صرف اللہ کی رضا کیلئے] حج کیا اور [دوران حج] ہر قسم کے فسق و فجور سے بچا رہا، تو وہ گناہوں سے یوں پاک و صاف ہو کر لوٹے گا جیسے اس دن پاک و صاف تھا کہ جب اس کی ماں نے اسے جنا)۔

مزید یہ کہ حج بیت اللہ کے موقع پر ہی آپ ﷺ نے وہ یادگار روئے مثال اور اہم ترین خطبہ ارشاد فرمایا جو کہ ”خطبہ حجۃ الوداع“ کے نام سے معروف ہے، اور جو کہ رنگ و نسل کی جھوٹی اور مصنوعی بنیادوں پر قائم تمام امتیازات کو مٹانے، ہر قسم کی طبقاتی کشمکش و منافرت کے خاتمے، نیز شرفِ انسانیت کی بحالی اور عدل و انصاف کے اصولوں کی بہر صورت پاسداری کے لحاظ سے رہتی دنیا تک تمام عالمِ انسانیت کیلئے فقید المثال منشور حیات اور دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

### ”اخلاقی کمزوری“ ”ایمانی کمزوری“ کی علامت ہے:

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن وحدیث میں اہل ایمان کو جہاں کسی عمدہ صفت اور اچھی عادت کو اپنانے، یا اسی طرح جہاں کسی برائی سے دامن بچائے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اکثر و بیشتر ”ایمان“ کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، گویا اس سے یہ یاد دہانی مقصود ہے کہ جس چیز کو اپنانے، یا جس چیز سے باز رہنے کی تمہیں تاکید و تلقین کی جا رہی ہے، یہ دراصل اسی ایمان کا تقاضا ہے جو تمہارا اصل سرمایہ اور تمہارے لئے سب سے قیمتی متاع ہے، اور جس پر تمہارے لئے دنیا و آخرت میں خیر و خوبی، عافیت و سلامتی، اور نجات و فلاح کا دار و مدار ہے۔

☆..... چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ”صدق“ یعنی ”سچائی“ جیسی اہم عادت اور اعلیٰ ترین صفت کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس آیت کی ابتداء میں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا.....﴾ یعنی: ”اے ایمان والو!.....!“ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچوں میں شامل ہو جاؤ) ☆ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ”شرم و حیا“ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: (الْحَيَاءُ وَالْإِيمَانُ قُرْنَاءُ جَمِيعاً، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ) (۲) ترجمہ: (”حیا“ اور ”ایمان“ دونوں ساتھی ہیں، لہذا اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز اٹھ جائے تو یقیناً دوسری بھی اٹھ جائے گی) یعنی حیا اور ایمان باہم لازم و ملزوم ہیں، لہذا

جس کسی میں ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز موجود ہوگی تو یقیناً دوسری بھی موجود ہوگی، اور اگر ان میں سے کوئی ایک چیز مفقود ہے تو یقیناً دوسری چیز بھی مفقود ہی ہوگی۔

☆..... اسی طرح پڑوسی کے ساتھ بدسلوکی کی حرمت و ممانعت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ملاحظہ ہو: (مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ) (۱) ترجمہ: (جو کوئی اللہ پر، اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو، وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے)

نیز ارشادِ نبوی ﷺ ملاحظہ ہو: (وَاللَّهُ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللَّهُ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللَّهُ لَا يُؤْمِنُ ، قِيلَ مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ : الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقِهِ) (۲) ترجمہ: (اللہ کی قسم! وہ شخص ہر گز مؤمن نہیں ہو سکتا، اللہ کی قسم! وہ شخص ہر گز مؤمن نہیں ہو سکتا، اللہ کی قسم! وہ شخص ہر گز مؤمن نہیں ہو سکتا، عرض کیا گیا کہ: وہ کون ہے اے اللہ کے رسول؟ فرمایا: ”یہ وہ شخص ہے کہ جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ رہ سکے)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک بار جب کسی عورت کے بارے میں یہ تذکرہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ نماز روزے اور صدقہ و خیرات کا اہتمام و التزام کرتی ہے، مگر یہ کہ اس کے پڑوسی اس کی تلخ کلامی اور بدزبانی سے بہت تنگ اور پریشان رہتے ہیں..... اس پر آپ ﷺ نے اس عورت کے بارے میں فرمایا کہ: (هِيَ فِي النَّارِ) یعنی: ”اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے“۔

جبکہ اس کے برعکس ایک اور عورت کے بارے میں یہ تذکرہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ نفل عبادات کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی، البتہ یہ کہ پڑوسیوں کے ساتھ اس کا اخلاق اور رویہ

(۱) بخاری [۵۶۷۱] باب اثم من لای آمن جاره بوائقه۔ نیز: [۵۷۸۵] نیز: [۶۱۱۰] باب حفظ اللسان.....

(۲) بخاری [۵۶۷۰] باب اثم من لای آمن جاره بوائقه۔



معاشرتی آداب و اخلاق (۴۸) اخلاقی کمزوری ایمانی کمزوری کی علامت

و سلوک بہت اچھا ہے، اس پر آپ ﷺ نے اس عورت کے بارے میں فرمایا کہ: (ہی

فِي الْجَنَّةِ) یعنی: ”اس کا ٹھکانہ جنت میں ہے“۔ (۱)

☆..... اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مہذب و شائستہ گفتگو، اور عمدہ طرزِ سخن اپنانے، نیز

ہمیشہ اچھی بات کہنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: (مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ فَلْيُكَلِّ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ) (۲) ترجمہ: (جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن

پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ اچھی بات ہی کہا کرے، ورنہ خاموش رہا کرے)

☆ اسی طرح ”امانت و دیانت“ نیز ”ایمانِ عہد“ کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں

ارشادِ نبویؐ ملاحظہ ہو: (لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ) (۳)

ترجمہ: (جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں، اور جو کوئی وعدے کا پابند نہیں اس کا

کوئی دین نہیں)

نیز آپ ﷺ نے ”منافق“ کی علامات اس طرح بیان فرمائی ہیں: (آيَةُ الْمُنَافِقِ

ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَ إِذَا أُوْتِمِنَ خَانَ) (۴)

ترجمہ: (منافق کی نشانیاں تین ہیں: جب بات کریگا جھوٹ بولیگا، جب وعدہ کریگا تو وعدہ

خلافی کریگا، اور اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائیگی تو اس میں خیانت کریگا)۔

☆..... حاصلِ کلام یہ کہ قرآن و حدیث کی مذکورہ نصوص سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ

(۱) احمد [۹۶۷۳]

(۲) بخاری [۶۱۱۰] باب حفظ اللسان.....☆ مسلم [۴۷]☆ ابن حبان [۵۱۶] ترمذی [۲۵۰۰]

(۳) احمد [۱۲۴۰۶]

(۴) بخاری [۳۳] باب ظلم دون ظلم، نیز بخاری: [۲۵۳۶] [۲۵۹۸] [۵۷۴۴] [۵۷۴۴] مسلم [۵۹] باب بیان خصال

المنافق۔ ترمذی [۲۶۳۱] باب ما جاء في علامة المنافق۔ احمد [۸۶۷۰]

”ایمان“ اور حسنِ اخلاق“ باہم لازم و ملزوم ہیں، اور یہ کہ ”اخلاقی کمزوری“ درحقیقت ”ایمانی کمزوری“ ہی کی علامت اور اسی کا لازمی نتیجہ ہے۔

یقیناً اس سے مسلمان کیلئے عمدہ اخلاق و صفات کو اپنانے اور برے اخلاق و عادات سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح و ثابت ہوتی ہے۔

☆..... اسلامی تعلیمات کی روشنی میں چند ”اخلاقی حُسن“ یعنی عمدہ و پاکیزہ اخلاق کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہو۔



## ”صدق“

☆..... یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ”صدق“ یعنی راست بازی و سچائی ہر خیر و خوبی کا منبع اور ہر فضیلت کا سرچشمہ ہے، جبکہ اس کے برعکس جھوٹ ہر خرابی اور ہر برائی کی بنیاد اور جڑ ہے۔

☆..... ”صدق“ کی اہمیت و فضیلت کے بارے میں اس سے بڑھکر اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ: ﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا﴾ (۱) ترجمہ: (اللہ سے زیادہ سچی بات والا اور کون ہوگا؟) نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا﴾ (۲) ترجمہ: (اور کون ہے جو اپنی بات میں اللہ سے زیادہ سچا ہو؟)

نیز ارشاد ہے: ﴿قُلْ صَدَقَ اللَّهُ﴾ (۳) ترجمہ: (کہہ دیجئے کہ اللہ سچا ہے) نیز ارشاد ہے: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا﴾ (۴) ترجمہ: (اور آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ ”سچائی“ کا اصل سرچشمہ خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات ہے۔

☆..... اور پھر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اسی سرچشمے سے ہی ”سچائی“ کو حاصل کیا اور پھر خلق خدا کو بھی اس سے سیراب اور فیضیاب کیا۔ ان حضرات نے خود بھی ہمیشہ ”سچائی“ کو اپنایا، اور اپنی تعلیمات و ہدایات کے ذریعے بندگان خدا کو بھی ہمیشہ اسی کی تاکید و تلقین فرمائی۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی سچائی و دیانت داری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (۱) ترجمہ: (اس کتاب میں ابراہیم [علیہ السلام] کا قصہ بیان کیجئے، بیشک وہ بڑی سچائی والے نبی تھے)

اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (۲) ترجمہ: (اس کتاب میں ادریس [علیہ السلام] کا بھی ذکر کیجئے، بیشک وہ بڑی سچائی والے نبی تھے)

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم کے تذکرہ کے ضمن میں ارشاد ہے: ﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ﴾ (۳) ترجمہ: (ان کی والدہ راست باز عورت تھیں)

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں ارشاد ہے: ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ (۴) ترجمہ: (اے بہت بڑے سچے یوسف.....!)

”حدیث جبریل“ میں بار بار یہ تذکرہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات پر جبریل علیہ السلام فرماتے: (صَدَقْتَ) یعنی: ”آپ نے سچ کہا“۔ (۵)

ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جب رسول اللہ ﷺ کو پیغام نکاح بھیجا تو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کیلئے اپنی پسندیدگی اور آپ ﷺ کے ساتھ نکاح کی خواہش کی وجہ یہ بیان فرمائی: (إِنِّي رَغِبْتُ فِيكَ لِقَرَابَتِكَ وَ أَمَانَتِكَ وَ حُسْنِ خُلُقِكَ وَ صِدْقِ

(۳) المائدہ [۵۷]

(۲) مریم [۵۶]

(۱) مریم [۴۱]

(۴) یوسف [۴۶]

(۵) بخاری [۵۰] عن أبي هريرة رضي الله عنه۔ نیز: مسلم [۸] عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه۔

حَدِيثُكَ (۱)

یعنی: ”میں آپ سے نکاح کی خواہشمند ہوں، آپ سے قربت داری کی وجہ سے نیز آپ کی امانت و دیانت، خوش اخلاقی، اور سچائی کی وجہ سے۔“

آپ ﷺ کو اپنے اور پرانے دوست اور دشمن، سب ہی ہمیشہ ”صادق“ اور ”امین“ کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

☆..... قرآن وحدیث میں جا بجا ”صدق“ کو اپنانے اور جھوٹ سے بچنے کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (۲) ترجمہ: (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو) اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾ (۳) ترجمہ: (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کہا کرو) اسی طرح ارشاد ہے: ﴿فَلَوْصَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (۴) ترجمہ: (اگر وہ اللہ کے ساتھ سچے رہیں تو ان کیلئے بہتری ہے)

اسی طرح اہل ایمان و اسلام جن کیلئے قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور اجرِ عظیم کی خوشخبری ہے ان کی صفات کے بیان میں اس چیز کا تذکرہ بھی ہے: ﴿وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ﴾ یعنی: ”سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں۔“ اور پھر آیت کے آخر میں ارشاد ہے: ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (۵) ترجمہ: (ان کیلئے اللہ نے [وسیع] مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے)

(۳) الاحزاب [۷۰]

(۲) التوبہ [۱۱۹]

(۱) السيرة النبوية لابن هشام [ج: ۱، ص: ۲۲]

(۵) الاحزاب [۳۵]

(۲) محمد [۲۱]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَ نَهْرٍ فِي مَقْعَدِ صَدَقٍ عِنْدَ مَلِكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۱) ترجمہ: (یقیناً ہمارا ڈر رکھنے والے جنتوں اور نہروں میں ہوں گے، سچائی اور عزت کی بیٹھک میں قدرت والے بادشاہ کے پاس)

نیز قرآن کریم میں ”صدیقین“ یعنی سچ بولنے والوں کا تذکرہ انبیاء اور شہداء کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول ﷺ کی پیروی کرے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ) ☆..... نیز قرآن کریم میں متعدد مواقع پر سچے لوگوں کی مدح و توصیف بیان کی گئی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿مَنْ الْمُؤْمِنِينَ رَجُلٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ (۳) ترجمہ: (مؤمنوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے جو عہد اللہ سے کیا تھا اسے سچا کر دکھایا، بعض نے تو اپنا عہد پورا کر دیا اور بعض [موقع کے] منتظر ہیں، اور انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی)

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۴) ترجمہ: (اور جو سچے دین کو لائے، اور جس نے اس کی تصدیق کی، یہی لوگ پارسا ہیں، ان کیلئے ان کے رب کے پاس [ہر] وہ چیز ہے جو یہ چاہیں، نیک لوگوں کا یہی بدلہ ہے)۔

☆..... نیز ”سچائی“ کی اہمیت و فضیلت اس بات سے واضح ہوتی ہے قرآن کریم میں اہل ایمان کے متعدد اوصاف کے تذکرہ کے بعد آخر میں ان کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ: ”یہی سچے لوگ ہیں“۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا، وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: (درحقیقت اچھا شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، [اللہ کی] کتاب پر، اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قربت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے، جب وعدہ کرے تو اسے پورا کرے، تنگدستی، دکھ درد، اور لڑائی کے وقت صبر کرے، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں)

☆..... حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت میں سے وہ حضرات جنہیں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی سعادت نصیب ہوئی، جنہوں نے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اپنا گھر بار، اپنا وطن اور کاروبار، اپنی زمین و جائیداد، اور اپنے عزیز و احباب وغیرہ کو چھوڑا، اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا مندی و خوشنودی کی خاطر اپنا سب ہی کچھ قربان کر دیا..... ان جلیل القدر ہستیوں کے بارے میں بھی قرآن کریم میں یہی

ارشاد ہے کہ: ”یہی سچے لوگ ہیں“۔

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (ان مہاجر مسکینوں کیلئے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں، وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی سچے لوگ ہیں)

☆..... اسی طرح قیامت کے روز ”صادقین“ کا مقام و مرتبہ قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہے: ﴿قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ، لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (۲) ترجمہ: (اللہ ارشاد فرمائے گا کہ: یہ وہ دن ہے کہ جو لوگ سچے تھے، ان کا سچا ہونا ان کے کام آئیگا، ان کو باغ ملیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش، اور یہ اللہ سے راضی اور خوش ہیں، یہ تو بڑی کامیابی ہے)

☆..... قرآن کریم میں ”صدق“ کے بالمقابل ”نفاق“ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح و ثابت ہوتی ہے کہ ”صدق“ ایمان کی علامت، دنیا و آخرت میں سعادت مندی اور صلاح و فلاح کا سبب ہے۔ جبکہ ”جھوٹ“ کفر و نفاق کی علامت اور دنیا و آخرت میں بربادی اور ذلت و رسوائی کا سبب ہے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ



إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱﴾ ترجمہ: (تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے، اور منافقوں کو اگر چاہے تو سزا دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے، یقیناً اللہ تو بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے)

اسی طرح قرآن کریم میں منافقین کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہے: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کیلئے دردناک عذاب ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْكََاذِبُونَ﴾ (۴) ترجمہ: (جھوٹی باتیں تو وہی لوگ بناتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں ہوتا، اور یہی لوگ جھوٹے ہیں)

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا: (آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا أُؤْتِمِنَ خَانَ) (۵) ترجمہ: (منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے گا جھوٹ بولیگا، جب وعدہ کریگا تو وعدہ خلافی کرے گا، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائیگی، اس میں خیانت کرے گا)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (مَا كَانَ مِنْ خُلُقٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ

(۱) الاحزاب [۲۴] (۲) البقرة [۱۰] (۳) المنافقون [۱] (۴) النحل [۱۰۵]

(۵) بخاری [۳۳] باب ظلم دون ظلم، نیز بخاری: [۲۵۳۶] [۲۵۹۸] [۵۷۴۳] [۵۷۴۳] [۵۷۴۳] مسلم [۵۹] باب بیان خصال المنافق۔ ترمذی [۲۶۳۱] باب ماجاء فی علامة المنافق۔ احمد [۸۶۷۰]

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْكَذِبِ (۱) ترجمہ: (رسول اللہ ﷺ کو ”جھوٹ“ سے بڑھ کر اور کوئی عادت ناپسند نہیں تھی) یعنی آپ ﷺ کی نظر میں ”جھوٹ“ سب سے زیادہ بری اور انتہائی ناپسندیدہ ترین عادت و خصلت تھی۔

☆..... یہ ایک اٹل اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سچ بولنے والا انسان ہمیشہ پرسکون و مطمئن رہتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس جھوٹا انسان ہمیشہ بے چین رہتا ہے، ذہنی سکون و اطمینان جیسی اہم ترین نعمت سے وہ ہمیشہ محروم ہی رہتا ہے۔ جھوٹ بول کر انسان کوئی عارضی اور وقتی فائدہ تو حاصل کر سکتا ہے، مگر اس کا یہ جھوٹ زندگی بھر کیلئے وبالِ جان اور مسلسل عذاب اور روگ بن جاتا ہے، اور اسے ہمہ وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں دنیا والوں کے سامنے اس کا جھوٹ ظاہر نہ ہو جائے، اسی فکر اور پریشانی کی وجہ سے اس کا سکون برباد ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی بے لطف اور بد مزہ ہو جاتی ہے۔

اسی حقیقت کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: (إِنَّ الصِّدْقَ طَمَآنِينَةٌ، وَإِنَّ الْكَذِبَ رِيبَةٌ) (۲) ترجمہ: (سچ میں سکون و اطمینان ہے، جبکہ جھوٹ بے اطمینانی اور شک و شبہ کا سبب ہے)

نیز یہ کہ خدا نخواستہ اگر کوئی ایسی صورتِ حال درپیش ہو کہ بظاہر سچ بولنے میں کسی نقصان کا اندیشہ ہو، ایسی صورتِ حال میں بھی اس حقیقت اور اس قانونِ قدرت کو خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ہمیشہ سچائی کو تھامے رکھنے میں ہی دونوں جہانوں میں عافیت و سلامتی ہے، جبکہ جھوٹ بول کر انسان وقتی طور پر تو اپنی جان بچا سکتا ہے، لیکن جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی آخر کار یہی جھوٹ اس کیلئے دونوں جہانوں میں رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سبب بن

(۱) الترغیب والترہیب [۴/۴۶۴] باب: الترغیب فی الصدق والترہیب من الکذب (بحوالہ: احمد والہز ارواہن

جائے گا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے مشہور و معروف واقعہ میں بھی رہتی دنیا تک تمام انسانیت کیلئے یہی پیغام ہے کہ ”سچائی“ کا راستہ اختیار کرنے میں ہی انسان کیلئے دنیا و آخرت میں صلاح و فلاح، عزت، عافیت اور سلامتی کا راز پوشیدہ ہے۔ (۱)

### ”صدق“ کے مراتب و درجات:

اہل علم نے ”صدق“ کے تین مراتب و درجات بیان کئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) صدق مع اللہ: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق میں سچا اور مخلص ہو، اس کا ہر قول و عمل خالصہ اپنے خالق و مالک کی رضامندی و خوشنودی کی خاطر ہو، نام و نمود اور ریاء کاری مقصود نہ ہو، نیز یہ کہ اس کے ظاہر و باطن میں کوئی اختلاف اور تضاد نہ ہو، اس کے دل میں یہ عقیدہ و ایمان راسخ و پیوست ہو کہ خلوت ہو یا جلوت، اس کا خالق و مالک اسے ہر جگہ اور ہر حالت میں دیکھ رہا ہے، اس کی ہر ہر بات کو سن رہا ہے، اس کا کوئی قول و فعل اس علیم وخبیر اور سمیع و بصیر سے کسی صورت مخفی نہیں رہ سکتا۔ اسی جذبہ و ایمان کے تحت وہ ہمیشہ اپنے خالق و مالک کی عبادت، اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں مشغول رہے اور اس کی رضامندی و خوشنودی کے حصول کیلئے کوشاں و سرگرم رہے۔

(۲) صدق مع الرسول ﷺ: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی ہر عبادت صرف اس شریعت کے مطابق انجام دے جو کہ رسول اللہ ﷺ من جانب اللہ لائے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ہر معاملے میں اور زندگی کے ہر شعبے میں رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت و پیروی کی

(۱) اس واقعہ کا تذکرہ سورہ توبہ میں ہے۔ نیز کتب حدیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

جائے۔ ”ابتداع“ کی بجائے ”اتباع“ کا مکمل اہتمام و التزام ہو، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ: (کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى، قِيلَ: وَمَنْ يَا أَبَى يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى) (۲) ترجمہ: (میری امت کے سب ہی لوگ جنت میں داخل ہو ہی جائیں گے سوائے اس شخص کے جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے، عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسول! ایسا شخص کون ہو سکتا ہے کہ جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دیا) (۳)

(۳) صدق مع الناس: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان بندگانِ خدا کے ساتھ اپنی گفت و شنید، لین دین، خرید و فروخت، رویہ و سلوک وغیرہ، غرضیکہ ہر معاملے میں مکمل سچائی و دیانت داری کا راستہ اختیار کرے۔ جھوٹ، خیانت، دھوکہ دہی، مکر و فریب اور ہر قسم کی بددیانتی سے مکمل اجتناب کرے۔

☆..... یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ”صدق“ یا سچائی اور راست بازی کا مفہوم

(۱) آل عمران [۳۱] (۲) بخاری [۶۸۵۱]

(۳) متعدد اہل علم کے بقول اس حدیث میں ”انکار“ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت کا انکار ہے۔

محض زبانی بات چیت اور انسانوں کی باہمی گفت و شنید تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ اور مفہوم بہت وسیع اور عام ہے۔ چنانچہ مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قول و فعل میں سچا ہو، اس کا ایمان بھی خالص اور سچا ہو، اس کا عزم بھی سچا ہو، اس کی نیت بھی سچی ہو، اور یہ کہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر معاملے میں وہ سچائی کے راستے پر مکمل ثابت قدمی و استقلال کے ساتھ گامزن اور رواں دواں رہے، کیونکہ یہی ایمان کی نشانی ہے، اور اسی میں بندے کیلئے دونوں جہانوں میں کامیابی و سعادت مندی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس جھوٹ کفر و نفاق کی علامت اور دونوں جہانوں میں بربادی کا سبب ہے۔ یہی مفہوم رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے واضح ہے: (عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَالْبِرُّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صَدِيقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذَّابًا) (۱) ترجمہ: (تم سچ کو تھامے رکھو، کیونکہ سچ نیکی تک پہنچاتا ہے، اور نیکی جنت تک پہنچاتی ہے، جو شخص ہمیشہ سچ ہی بولتا رہتا ہے اور سچائی کے راستے پر ہی چلتا رہتا ہے، اللہ کے نزدیک اسے ”سچا“ لکھ لیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ برائی تک لے جاتا ہے، اور برائی [جہنم کی] آگ تک پہنچاتی ہے، اور جو کوئی ہمیشہ جھوٹ ہی بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کے راستے پر ہی گامزن رہتا ہے، اسے اللہ کے نزدیک ”جھوٹا“ لکھ لیا جاتا ہے۔)

## ”امانت و دیانت“

اس دنیا میں ہر انسان کی فطری طور پر یہی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایسا ماحول اور ایسا معاشرہ نصیب ہو سکے جہاں امن و امان، سکون و اطمینان اور محبت و ہمدردی کی فضا ہو، اور کسی بھی معاشرے میں اس مقصد کے حصول کیلئے ”امانت و دیانت“ بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ جس معاشرے سے امانت و دیانت ختم ہو جائے وہاں ہر جگہ ناقابل اصلاح بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، باہمی اعتماد مفقود ہو جاتا ہے، امن و امان، خوشحالی و اطمینان کی بجائے وہاں افراتفری، بے چینی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے، خواہ کاروباری معاملات ہوں یا گھریلو تعلقات، ہر جگہ خرابی و بربادی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور یوں پورا معاشرہ اجتماعی موت کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

اسی لئے اسلام میں ”امانت و دیانت“ کی بہت بڑی اہمیت ہے، اور قرآن و حدیث میں جابجا اس کی تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں اہل ایمان کے اوصاف کے بیان میں ارشاد ہے ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور جو اپنی امانتوں اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہیں)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ) (۲) ترجمہ: (جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جو کوئی وعدے کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں)

اسی طرح ارشاد نبویؐ ہے: (آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا أُؤْتِمِنَ خَانَ) (۱) ترجمہ: (منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے گا تو جھوٹ بولے گا، جب وعدہ کرے گا تو وعدہ خلافی کرے گا، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے گی تو اس میں خیانت کرے گا)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (إِذَا ضَيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ) (۲) ترجمہ: (جب امانت ضائع کی جانے لگے، تب تم قیامت کا انتظار کرو)

اسی طرح ارشاد نبویؐ ہے: (أَرْبَعٌ إِذَا كُنَّ فِيكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا: حِفْظُ أَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيثٍ، وَحُسْنُ خَلِيقَةٍ، وَعِفَّةٌ فِي طُعْمَةٍ) (۳) ترجمہ: (چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ تمہیں نصیب ہو جائیں تو پھر اور کچھ اگر تمہیں نہ بھی ملے تب بھی غم کی کوئی بات نہیں: امانت داری، راست گوئی، خوش اخلاقی، اور رزقِ حلال)

### ☆ امانت کی اقسام:

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (۴) ترجمہ: (اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول [کے حقوق] میں جانتے ہوئے خیانت مت کرو اور اپنی قابلِ حفاظت چیزوں میں خیانت مت کرو)

اس آیت میں ایمان والوں کو اللہ کے ساتھ خیانت، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت، نیز باہم ایک دوسرے کے ساتھ خیانت سے منع کیا گیا ہے، لہذا اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امانت اور اس میں خیانت کی درحقیقت تین صورتیں ہیں جن کے بارے میں مسلمان

کیلئے بصیرت و آگاہی ضروری ہے، لہذا اس سلسلے میں ہر مسلمان کے ذہن میں یہ بات توتنی چاہئے کہ امانت و دیانت کے موضوع پر جب بھی بات ہوگی تو اس میں امانت کی مذکورہ تینوں اقسام شامل ہوں گی جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

### (۱) اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ امانت و دیانت:

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے ذمے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے جو حقوق ہیں، یاد دینی فراغت و واجبات اور شرعی احکام ہیں، مکمل خلوص نیت کے ساتھ ان کی تعمیل اور بجا آوری کی پوری کوشش کی جائے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حقوق میں سے یقیناً سب سے اہم ترین اور اولین حق عقیدہ توحید کا اقرار و اظہار، اس پر مکمل یقین و ایمان، نیز عملی زندگی میں اس کی تصدیق اور اس کے تقاضوں کی تکمیل ہے، روزِ ازل انسان سے اسی بات کا عہد لیا گیا تھا جس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ، قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا ، أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔ تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے)۔

چنانچہ اس ارشادِ ربانی کے مطابق اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی توحید کا صدقِ دل سے اقرار و اظہار اور ہر قسم کے شرک سے اپنا دامن بچائے رکھنا انسان کے ذمے اللہ کی طرف سے



امانت ہے۔

اسی طرح تمام شرعی احکام بھی اللہ کی طرف سے بندے کے ذمے امانت ہیں، جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ مقصود ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾ (۱) ترجمہ: (ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا، لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے [مگر] انسان نے اسے اٹھالیا)

لہذا نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ و دیگر تمام عبادات و شرعی احکام و دینی فرائض و واجبات چونکہ اللہ کی طرف سے مقرر فرمودہ ہیں اسلئے یہ سب بھی بندے کے ذمے اللہ کی طرف سے امانت ہیں جن کے بارے میں قیامت کے روز حساب و کتاب ہوگا، لہذا بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی ان امانتوں کی حفاظت اور پاسداری کرے اور انہیں ضائع کر کے اپنی دنیا و آخرت برباد نہ کرے۔

## (۲) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ امانت و دیانت:

اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کی ہر عبادت کی صحت اور عند اللہ قبولیت کیلئے اتباعِ سنت ضروری ہے، یعنی وہ عبادت اس ہدایت اور اس طریقے کے مطابق ہو جو اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو سکھایا اور بتایا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (۲) ترجمہ: (کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری

کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے)

نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو یقیناً اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کی طرف سے تمام بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کی غرض سے اسوہ حسنہ یعنی بہترین نمونہ بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے، لہذا مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایات و تعلیمات کو اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھے اور ان تعلیمات کے مطابق عمل کو اپنے ذمے امانت تصور کرتے ہوئے آپ کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کرے اور نافرمانی سے بچے، کیونکہ دنیا و آخرت میں کامیابی و سرخروئی کیلئے رسول اللہ ﷺ کا اتباع ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۱)

ترجمہ: (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی)

نیز ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَأَنْ تَطِيعُوهُ تَهْتَدُوا﴾ (۲) ترجمہ: (اگر تم ان [رسول] کی اطاعت کرو گے تب ہی تم ہدایت پاسکو گے)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى ، قِيلَ : وَمَنْ يَا بَنِي يَارَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ : مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى) (۳) ترجمہ: (میری تمام امت کو جنت میں داخلہ نصیب ہو جائے گا سوائے اس شخص کے جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ایسا کون شخص کون ہوگا جو جنت میں جانے سے خود ہی انکار کر دے [یعنی جنت کو ٹھکرا دے]؟ آپ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا،

اور جس نے میری نافرمانی کی وہ [جہنم کی] آگ میں جائے گا (۱)

### (۳) انسانوں میں باہمی امانت و دیانت:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿فَلْيُوْذِ الَّذِي اَوْثَمْنَ اَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ﴾ (۲)

ترجمہ: (جس کے پاس امانت رکھی گئی ہو وہ اسے ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ (۳)

ترجمہ: (بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں تاکید کرتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ)

اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے امانتوں کو ان کے حقداروں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے، اس کا مفہوم وسیع اور عام ہے، یعنی امانت خواہ مال و دولت، روپے پیسے یا زمین جائیداد کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں ہو، بہر حال اسے اس کے اصل اور حقیقی مستحق کے حوالے کرنا ضروری ہے، جو کوئی جس سلوک کا مستحق ہے اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے، جو جس قدر انعام و اکرام اور تحسین و آفرین کا مستحق ہے اسے اس کا یہ جائز حق دیا جائے، جو طالب علم جس قدر نمبروں کا مستحق ہے اسے وہ نمبر ضرور دیئے جائیں، جو کوئی جس عہدے یا منصب یا کسی ملازمت کا جائز حق دار ہے اسے اس کا یہ حق ضرور دیا جائے، کسی ملازمت یا عہدے کا معاملہ ہو یا کسی تعلیمی ادارے میں داخلے کا مسئلہ ہو، ایسے مواقع پر جائز حق داروں اور قابل و لائق افراد کو نظر انداز کر کے محض قرابت داری ذاتی

(۱) متعدد اہل علم کے بقول اس حدیث میں ”انکار“ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت کا انکار ہے۔

(۲) البقرہ [۲۸۳] (۳) النساء [۵۸]

تعلقات، سفارش، یا رشوت کی بناء پر نا اہل اور نالائق افراد کو آگے بڑھانا اور ترجیح و فوقیت دینا انتہائی بدترین خیانت اور قرب قیامت کی علامت ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (اِذَا وُسِدَ الْأَمْرُ إِلَىٰ غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ) (۱) ترجمہ: (جب کوئی کام [یا عہدہ اور منصب] کسی ایسے شخص کے حوالے کیا جائے لگے جو اس کا مستحق نہ ہو، تب تم قیامت کا انتظار شروع کر دو)

نیز ارشاد نبویؐ ہے: (كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ) (۲) ترجمہ: (تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا) یعنی اس دنیا میں ہر انسان خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا فقیر، کسی نہ کسی درجے میں نگہبان ہے اور اس کی کچھ ذمے داریاں ہیں جن کے بارے میں وہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔

☆..... اگر کوئی کسی ملک یا علاقے کا حکمران یا سربراہ ہے تو تمام رعیت اس کے ذمے امانت ہے اور وہ اللہ کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔

☆..... کوئی کسی ادارے یا کسی دفتر یا کمپنی کا سربراہ ہے تو وہاں اس کے ماتحت کام کرنے والے تمام افراد اس کے ذمے امانت ہیں اور وہ ان سب کے بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔

☆..... درس گاہ یا کلاس میں تمام طلبہ استاد کے ذمے امانت ہیں۔

☆..... اگر کوئی ڈاکٹر ہے تو مریض اس کے ذمے امانت ہیں، نیز مریضوں کی طرف سے اس کے سامنے بغرض علاج ظاہر کئے گئے تمام کوائف و حالات اس کے ذمے امانت اور راز ہیں۔

☆..... اگر کوئی ہوائی جہاز کا پائلٹ ہے یا کسی بھی سواری کا ڈرائیور ہے تو تمام مسافراں کے ذمے امانت ہیں اور وہ اللہ کے سامنے ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔

☆..... اگر کوئی مزدور ہے تو مکمل خلوص، لگن، اور محنت و جاں فشانی کے ساتھ درست طریقے سے کام کی انجام دہی اس کے ذمے امانت ہے۔

☆..... جبکہ خودیہ مزدور اور اس کی مزدوری اس آجر کے ذمے امانت ہے جس کیلئے یہ مزدور محنت و مشقت اور مزدوری کر رہا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (أَعْطُوا الْأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ) (۱) ترجمہ: (مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دو)

☆..... اسی طرح اگر کوئی تاجر ہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت اور خرید و فروخت میں امانت و دیانت سے کام لے، ناپ تول نیز وزن اور پیمائش وغیرہ میں کمی بیشی نہ کرے چیزوں میں ملاوٹ نہ کرے، کسی بیکار اور عیب دار چیز کو خریدار کے سامنے اپنی ہوشیاری اور عیاری سے عمدہ ظاہر کر کے فروخت نہ کرے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَ إِذَا كَالُوا لَهُمْ أَوْ وَزَنُوا لَهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (بربادی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کیلئے، کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا) (۳) ترجمہ: (جس نے ہمیں دھوکہ دیا [یا ملاوٹ کی] وہ ہم میں سے نہیں)۔

قرآن کریم میں متعدد مواقع پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ وہ لوگ چیزوں میں ملاوٹ، اور ناپ تول میں کمی کیا کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام انہیں اس حرکت سے باز رہنے کی مسلسل نصیحت اور وعظ و تلقین فرماتے رہے، مگر ان پر اس وعظ و نصیحت کا قطعاً کوئی اثر نہ ہوا، اور وہ اپنی خیانت و بددیانتی پر مسلسل اڑے رہے، آخر ان کے اسی جرمِ عظیم کے نتیجے میں ان پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ایسا عذاب نازل کیا گیا کہ اس قوم کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔

لہذا یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کاروباری خیانت و بددیانتی اس قدر گھناؤنا فعل اور ایسا عظیم جرم ہے کہ جس کے نتیجے میں اللہ کا عذاب اور غضب نازل ہو سکتا ہے۔

☆..... اسی طرح انسان کے اہل و عیال بھی اس کے ذمے امانت ہیں اور وہ ان کے بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔

اور یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ انسان کے ذمے اہل و عیال کی یہ ذمہ داری محض ان کی ظاہری و جسمانی ضروریات مثلاً خوراک و لباس وغیرہ تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کی کردار سازی اور اخلاقی و روحانی تربیت کی ذمہ داری بھی شامل ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَ أَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (۱) ترجمہ: (اے ایمان والو! بچاؤ خود اپنے آپ کو بھی اور اپنے اہل و عیال کو بھی [جہنم کی آگ سے])۔

☆..... اسی طرح دو افراد کے درمیان ہونے والی کوئی گفتگو یا کسی محفل میں کی جانے والی

باتیں بھی امانت ہیں اور تمام شرکائے محفل کی یہ دینی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ان باتوں کو اپنے تک محدود رکھیں اور کسی غیر متعلق شخص کے سامنے انہیں ظاہر نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيثَ ثُمَّ التَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ) (۱) ترجمہ: (جب کوئی شخص کسی کے سامنے کوئی بات کہے اور پھر وہاں سے چلتا بنے تو) اس کی کہی ہوئی [یہ بات بھی] سننے والے کے ذمے [امانت ہے]

☆..... اگر کوئی شخص کسی سے کوئی مشورہ طلب کرتا ہے، تو جس سے مشورہ طلب کیا گیا ہے اس کے ذمے یہ بات امانت ہے کہ وہ اپنی دانست کے مطابق مکمل ایمان داری کے ساتھ اسے درست اور مناسب مشورہ دے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (المُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ) (۲) یعنی: ”جس کسی سے مشورہ طلب کیا جائے وہ [اس چیز کو اپنے ذمے امانت تصور کرتے ہوئے] مکمل ایمان داری کے ساتھ مشورہ دے“۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی امانت و دیانت؛ امت کیلئے اُسوہ حسنہ:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۳) ترجمہ: (تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں یقیناً بہترین نمونہ ہے)

اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں اہل ایمان کیلئے یقیناً ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ میں اُسوہ حسنہ اور بہترین نمونہ موجود ہے، لہذا امانت و دیانت کے سلسلے میں بھی آپ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کی پاکیزہ سیرت ہمارے لئے مشعلِ راہ اور بہترین نمونہ ہے، چنانچہ اس

(۱) ترمذی [۱۹۵۹] باب ملجاء أَنَّ المجالس أمانة۔ (۲) ترمذی [۲۸۲۲] (۳) الاحزاب [۲۱]

بارے میں تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح اور عیاں ہے کہ آپ ﷺ شہر مکہ میں اپنی نوعمری کے زمانے سے ہی ”صادق و امین“ کے لقب سے مشہور تھے، آپ ﷺ کے اخلاقِ حمیدہ، شرافت، نیکی، سچائی، امانت و دیانت، معصومانہ اور بے داغ زندگی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کی وجہ سے آپ ﷺ کے بدترین دشمن بھی آپ کو اسی لقب سے پکارتے تھے اور آپ کی امانت و دیانت کے بلاچون و چرا معترف تھے، آپ ﷺ کو کفارِ مکہ نے ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں پہنچائیں، کبھی آپ کا مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) کیا گیا، کبھی آپ پر پتھر برسائے گئے اور لہو لہان کیا گیا، کبھی ان بد بختوں نے آپ کو جادو گر اور کبھی دیوانہ کہا، غرضیکہ دشمنانِ اسلام آپ کو جس قدر جسمانی و نفسیاتی تکلیفیں پہنچا سکتے تھے انہوں نے وہ تکلیفیں پہنچائیں اور اس میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، مگر اس کے باوجود کبھی کسی بدترین دشمن نے بھی آپ ﷺ کو بد دیانت یا خائن اور بے ایمان نہیں کہا..... اور یہ بھی تاریخِ عالم کا یقیناً ایک بڑا عجبہ ہے کہ ہجرت کی رات جب کفارِ مکہ کی طرف سے آپ ﷺ کے قتل کی سازش تیار تھی اور اس مقصد کیلئے تمام ضروری کارروائی اور تیاری مکمل کی جا چکی تھی، آپ کے قتل کی غرض سے آپ کے گھر کا محاصرہ کیا جا چکا تھا اور چاق و چوبند جوانوں کی ایک بڑی تعداد ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے مستعد اور تیار کھڑی تھی، اس وقت بھی ان بد بختوں اور بدترین دشمنوں کی امانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس تھیں، کس قدر عجیب بات ہے کہ کفارِ مکہ جو آپس میں بہترین دوست تھے، ایک ساتھ گھومتے پھرتے، جوئے کی بازیوں میں اور شراب کی محفلوں میں وہ سب ساتھ ہوتے، مگر اس کے باوجود انہیں آپس میں ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں تھا، پورے شہر مکہ میں انہیں اگر کسی پر بھروسہ تھا، تو وہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی کی شخصیت تھی۔



نیز رسول اللہ ﷺ کی بے نظیر امانت و دیانت بھی ملاحظہ ہو کہ آپ ﷺ اگر چاہتے تو ان کی وہ سب امانتیں اپنے ساتھ مدینہ لے جاتے..... لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، آپ نے یہ نہیں سوچا کہ انہی کفار مکہ کی بدسلوکیوں اور ایذا رسانیوں کی وجہ سے تو میں گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہو رہا ہوں، انہی کے مظالم اور سختیوں کی وجہ سے میں اپنے آباء و اجداد کے شہر سے جدائی اور ہجرت پر مجبور ہو گیا ہوں، لہذا..... چلو چلتے چلتے میں ان کی امانتیں بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ لیتا جاؤں..... !! آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ سفر ہجرت کے موقع پر مکہ مکرمہ سے اپنی خفیہ روانگی سے قبل آپ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں اس بات کی خاص تاکید فرمائی کہ میری روانگی کے بعد یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کر دی جائیں، یقیناً امانت و دیانت کی یہ ایسی مثال ہے کہ دنیا جس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔

### ☆ گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کی امانت و دیانت:

قرآن کریم میں سورہ الشعراء میں متعدد انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے تذکرہ میں ایک بات خاص طور پر ذکر کی گئی ہے، وہ یہ کہ ان میں سے ہر نبی نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہا کہ: ﴿إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴾ (۱) یعنی: ”میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اس حال میں کہ میں ”امین“ یعنی امانت دار ہوں۔“

اس سے امانت و دیانت کی اہمیت واضح ہوتی ہے، کیونکہ اس سورت میں بار بار گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کی اس صفت (امانت و دیانت) کا بطور خاص تذکرہ کیا گیا ہے۔

### ☆ جبریل علیہ السلام کی امانت و دیانت:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور یقیناً یہ [قرآن] تورب العالمین کا نازل فرمایا ہوا ہے، اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ ﷺ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں)

اس آیت میں حضرت جبریل علیہ السلام کیلئے ”امین“، یعنی: امانت دار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿..... مُطَاعٍ ثُمَّ أَمِينٌ﴾ (۲) ترجمہ: (..... جس کی وہاں [آسمانوں میں] اطاعت کی جاتی ہے، جو امین ہے) (۳)

اس آیت میں بھی ”امین“ سے مراد حضرت جبریل امین علیہ السلام ہیں۔

غور طلب بات ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام جو تمام فرشتوں کے سردار ہیں اور جن کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت ہی خاص اور بلند ترین مقام و مرتبہ ہے، انہیں قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ”امین“ کے لقب سے یاد کیا جانا یقیناً ”امانت و دیانت“ کی اہمیت و ضرورت کو واضح کرتا ہے۔

☆..... لہذا ہر مسلمان کو اس بارے میں غور و فکر کرنے، نیز ”امانت و دیانت“ کے حوالے سے مکمل خلوص نیت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنا محاسبہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

(۲) التکویر [۱۲]

(۱) الشعراء [۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴]

(۳) یعنی وہاں آسمانوں میں تمام فرشتے حضرت جبریل امین علیہ السلام کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔

## ”ایفائے عہد“

انسانی معاشرے میں باہم ذاتی معاملات ہوں، یا تجارتی و کاروباری امور ہوں، کوئی اخلاقی مسئلہ یا قول و قرار ہو یا مالی لین دین اور خرید و فروخت سے متعلق کوئی عہد و پیمان ہو، بہر حال ان تمام امور کا انحصار بڑی حد تک آپس کے وعدوں اور معاہدوں پر ہی ہوتا ہے، اگر ان باہمی وعدوں اور قول و قرار کی پابندی کا اہتمام و التزام ہو تو معاشرے میں روزمرہ کے تمام امور بغیر خوبی چلتے رہتے ہیں، جبکہ قول و قرار یا وعدے کی خلاف ورزی یا معاہدے سے انحراف کی صورت میں باہمی اعتماد مجروح ہو جاتا ہے، دلوں میں وسوسے اور اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں، جس کے نتیجے میں تمام معاملات بگڑ جاتے ہیں اور معاشرے کی دیواروں میں شگاف پڑنے لگتے ہیں، اور یوں معاشرہ زوال و انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔

لہذا معاشرے میں ”وفا“ یا ”ایفائے عہد“ کو یقیناً بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی لئے قرآن وحدیث میں ”ایفائے عہد“ کی بار بار تاکید و تلقین کی گئی ہے، اور اسے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

☆ چنانچہ قرآن کریم میں اہل ایمان کے اوصاف کے تذکرہ کے ضمن میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (جو اپنی امانتوں اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہیں)

نیز ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ يُوْفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَ لَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ﴾ (۲) ترجمہ: (جو اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہیں اور قول و قرار کو توڑتے نہیں)

جبکہ اس کے برعکس ”عہد شکنی“ یا وعدہ خلافی، کو نفاق کی علامت اور فاسقوں کا شیوہ بتایا گیا ہے۔

چنانچہ کفار و منافقین کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور ان میں سے اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا اور ان میں سے اکثر لوگوں کو ہم نے نافرمان ہی پایا)

☆ ”ایفائے عہد“ کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم میں متعدد مواقع پر اس کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (۳) ترجمہ: (اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ (۴) ترجمہ: (اور پورا کرو وعدے کو، کیونکہ یقیناً وعدوں کے بارے میں باز پرس کی جائیگی)

☆ خصوصاً جب کوئی معاہدہ اللہ کے نام پر کیا گیا ہو، معاہدہ کرتے وقت اللہ کا واسطہ دیا گیا ہو یا اللہ کی قسم کھائی ہو تو ایسے حلفیہ معاہدے کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت تو بہت زیادہ

(۳) المائدہ [۱]

(۲) الاعراف [۱۰۲]

(۱) البقرہ [۲۷]

(۴) الاسراء بنی اسرائیل [۳۴]

بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہ تو گویا اللہ کے ساتھ معاہدہ ہے، لہذا ایسے معاہدے کی حفاظت اور اس کا لحاظ انتہائی ضروری ہے بلکہ جزو ایمان ہے، اور اس کی خلاف ورزی انتہائی سنگین جرم اور فتنہ ترین عمل ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اس کو پورا کرو، اس بات کا اللہ نے تمہیں تاکید کی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْإِيمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم آپس میں قول و قرار کرو، اور قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو، حالانکہ تم اللہ کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو بخوبی جان رہا ہے)

ارشادِ ربانی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۳) کی رو سے رسول اللہ ﷺ کی ہستی ہمارے لئے زندگی کے ہر معاملے میں اور ہر شعبے میں بہترین نمونہ اور مثال ہے۔ ”ایفائے عہد“ کے حوالے سے آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح و عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ ہر معاہدے کی مکمل پابندی فرمائی، تاریخ گواہ ہے کہ آپ ﷺ نے کفار و مشرکین اور بدترین دشمنوں کے ساتھ کئے گئے ہر معاہدے کا بھی مکمل احترام و لحاظ رکھا، اور یوں آپ ﷺ نے تمام دنیائے انسانیت کیلئے روشن اور قابل تقلید مثال قائم فرمائی۔

نیز آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعے امت کو بھی ہمیشہ ”ایفائے عہد“ کا حکم دیا، اور ”عہد شکنی“ یا ”غدار“ سے باز رہنے کی تاکید و تلقین فرمائی، اور اسے منافقین کا شیوہ قرار دیا۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: (آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا أُؤْتِمِنَ خَانَ) (۱) ترجمہ: (منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے گا تو جھوٹ بولے گا، جب وعدہ کرے گا تو وعدہ خلافی کرے گا، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے گی تو اس میں خیانت کرے گا)

اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ ہے: (لِكُلِّ غَادِرٍ لِّوَاءٌ عِنْدَ إِسْتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) (۲) ترجمہ: (قیامت کے روز ہر غدار کی پیٹھ پر ایک جھنڈا نصب کیا جائیگا) یعنی ہر ”عہد شکن“ یا ”غدار“ کے ساتھ قیامت کے روز یہ سلوک کیا جائیگا کہ اس کی پیٹھ پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، تاکہ وہ شخص خوب نمایاں ہو جائے، اور تمام خلقِ خدا اس منظر کو دیکھ لے اور اس بات کو جان لے کہ یہ شخص ”غدار“ ہے۔

☆ ”ایفائے عہد“ کی اہمیت کے ضمن میں یہ بات بھی ذہنوں میں رہنی چاہئے کہ انسان کیلئے سب سے اہم ترین عہد وہ ہے جو اس نے روزِ ازل اپنے خالق و مالک کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی مکمل اطاعت و بندگی کا عہد، صرف اسی کی عبادت کا عہد، ”عقیدہ توحید“ پر قائم رہنے اور ہر قسم کے شرک، اور معصیت و ضلالت سے مکمل اجتناب کا عہد.....!!

(۱) بخاری [۳۳] باب ظلم دون ظلم، نیز بخاری: [۲۵۳۶] [۲۵۹۸] [۵۷۴۴] [۵۷۴۴] - مسلم [۵۹] باب بیان خصال

المنافق - ترمذی [۲۲۳۱] باب ماجاء فی علامۃ المنافق - احمد [۸۶۷۰]

(۲) مسلم [۱۷۳۸]

اسی عہد کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ، قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں)

اسی طرح ارشادِ ربانی ہے: ﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَلَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ وَأَنْ اْعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ﴾ (۲) ترجمہ: (اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے قول و قرار نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی عبادت کرنا، سیدھی راہ یہی ہے)

لہذا مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ کئے ہوئے اپنے اس عہد کو ہمیشہ یاد رکھے، اس کے ذہن میں اس بارے میں جو ابد ہی کا احساس بیدار رہے، اور اس عہد و پیمان کو نبھانے کی فکر دامن گیر رہے۔

### ☆ ضروری تنبیہ:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ ”ایفائے عہد“ کے ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بسا اوقات تنگدستی و مشکلات اور فقر و فاقہ میں مبتلا کوئی انسان یہ حسرت و آرزو کرتا ہے کہ کاش اس کے دن پھر جائیں، اسے بھی خوشحالی و آسودگی اور سکھ چین کی زندگی نصیب ہو سکے..... اس مقصد کیلئے وہ اپنے خالق و مالک کے سامنے التجاء و فریاد اور خوب آہ و زاری بھی کرتا ہے۔

لیکن اس بارے میں عام مشاہدہ یہ ہے کہ جو انہی فقر و فاقہ میں مبتلا اس انسان کی دعاء و فریاد رنگ لاتی ہے، اور اسے اللہ کے فضل و کرم اور انعام و احسان کی بدولت خوشحالی و فروانی نصیب ہونے لگتی ہے، تو اس کے زاویہ نگاہ، انداز فکر، رہن سہن، نشست و برخاست، اور رفتار و گفتار میں خاص قسم کی تبدیلی آ جاتی ہے، اور قابل غور بات یہ ہے کہ اس تبدیلی کا سب سے اہم عنصر یہ ہوتا ہے کہ اب اس کی ہر ہر ادا اور ہر نقل و حرکت میں آزاد خیالی، شرعی احکام و تعلیمات سے غفلت و روگردانی، نیز اخلاقی حدود و قیود سے دوری و بیزاری کی جھلک نمایاں ہونے لگتی ہے، اور وہ بزبان حال اس بات کا اظہار و اعلان کرنے لگتا ہے کہ اب اس کی نظر میں شرعی احکام و تعلیمات، دینی آداب، اور اخلاقی حدود و قیود کی کوئی اہمیت نہیں، اور یہ کہ یہ تمام چیزیں تو محض دقیانوسی اور فرسودہ قسم کے خیالات کا مجموعہ ہیں، جو کہ صرف پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے فقراء و مساکین کو ہی زیب دیتے ہیں۔

حالانکہ مروت بلکہ ”وفاداری“ کا تقاضا تو یقیناً یہ ہے کہ بندے کیلئے اس کے خالق و مالک کی طرف سے جس قدر نعمتوں اور احسانات میں اضافہ ہو، اسی قدر بندے کی طرف سے بھی اپنے خالق و مالک اور منعم و محسن کی عبادت و بندگی، اس کی اطاعت و فرمانبرداری، اور اس کے سامنے عجز و انکسار کے جذبات میں بھی ترقی و اضافہ ہوتا چلا جائے، اس مہربان آقا کے سامنے اس کی جبین نیاز جھکتی چلی جائے، اور اس کی نافرمانی کرتے ہوئے اسے شرم محسوس ہو، نیز یہ خوف دامن گیر رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی کسی حرکت یا لغزش سے ناراض ہو کر اس کا وہ منعم و محسن اپنی عطاء کردہ نعمتیں واپس لے لے.....!!

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (۱)



ترجمہ: (ہم نے آپ کو خیر کثیر عطاء کی ہے، پس آپ اپنے رب کیلئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے)

ان آیات کے معانی و مفاہیم میں تدبر اور غور و فکر کرنے پر ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے کسی بندے پر انعام و احسان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جس قدر انعام و احسان میں اضافہ ہو، بندہ بھی اسی قدر اپنے مولیٰ اور منعم و محسن کے ساتھ وفاداری، احسان مندی اور اس کی عبادت گزاری کا اہتمام و التزام کرے، اس کی رضامندی و خوشنودی کے حصول کیلئے، نیز اس کی خفگی و ناراضگی سے بچنے کیلئے کوشش و جستجو میں مشغول و منہمک رہے، یہی قرآن کا پیغام ہے اور یہی اہل ایمان کی شان ہے۔

جبکہ اس کے برعکس تنگدستی و فقر و فاقہ، یا کسی مہلک و جان لیوا مرض، یا اور کسی بھی قسم کی آفت و مصیبت میں مبتلا شخص کو اگر اللہ کے فضل و کرم سے ان مشکلات و آفات سے نجات نصیب ہو جائے، اور فقر و فاقہ کی بجائے خوشحالی و فراوانی اور ہر طرح کی آسودگی میسر آ جائے، ایسے میں وہ شخص اپنے منعم و محسن کا شکر گزار بنے اور اس کی اطاعت شعاری کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے اس سے غفلت و اعراض اور اس کی نافرمانی کی راہ اپنالے تو یقیناً یہ بہت بڑی بد نصیبی ہوگی، بلکہ یہ تو اپنے خالق و مالک اور منعم و محسن کے ساتھ بہت بڑی بیوفائی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہ تو بہت ہی بڑا نفاق ہوگا، کیونکہ قرآن کریم میں اس چیز کو منافقین کا شیوہ قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ ، فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ ، فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا

وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ، أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ  
وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿۱﴾

ترجمہ: (اور ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے مال دے گا تو ہم ضرور صدقہ و خیرات کریں گے، اور خوب نیکوکاروں میں ہو جائیں گے۔ لیکن جب اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا تو یہ اس میں بخل کرنے لگے اور ٹال مٹول کر کے منہ موڑ لیا۔ پس اس کی سزا میں اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اللہ سے ملاقات کے دن تک، کیونکہ انہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کے خلاف کیا اور کیونکہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ کو ان کے دل کا بھیدا اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ غیب کی تمام باتوں سے خبردار ہے)۔



## ”عدل و انصاف“

”عدل و انصاف“ کی اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ معاشرے میں اگر ہر فرد کو اس کا جائز حق اور اس کی محنت کا صلہ و معاوضہ ملتا رہے تو خیریت و عافیت، امن و امان اور سکون و اطمینان کی فضا قائم رہتی ہے۔ لیکن اگر انسان کو اس کے جائز حق سے محروم رکھا جائے اور اس کی محنت کا صلہ نہ دیا جائے تو وہ احساس محرومی کا شکار ہو جاتا ہے، اور اس کے دل میں انتقامی جذبات بھڑکنے لگتے ہیں، اس کی تعمیری صلاحیتیں تخریبی سرگرمیوں کی نذر ہو جاتی ہیں، اور یوں خیر و خوبی اور ترقی و بہتری کی طرف سفر کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے اور معاشرہ شکست و ریخت اور زوال و انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔

☆..... نیز ”عدل و انصاف“ کی اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خود اپنے ”کلام“ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا﴾ (۱) ترجمہ: (اور آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے)

یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کلام اس کا ہر حکم اور ہر فیصلہ سچائی اور عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

☆..... نیز یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں الْعَدْلُ اور الْمُقْسِطُ بھی شامل ہیں۔ ان دونوں کے معنی ہیں ”انصاف کرنے والا“۔ یعنی عدل و انصاف تو خود رب کائنات اور خالق ارض و سماء کی پاکیزہ صفات میں سے ہے، اس رب نے اس تمام کائنات کو انصاف کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اور اس نظام کائنات کی بنیاد بھی

عدل و انصاف ہی پر رکھی ہے، اور پھر اپنے بندوں کو بھی اپنے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور یوں خالق ارض و سماء نے اس اہم ترین راز کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اس کائنات کی بقاء، اور انسانیت کی بہتری و ترقی اور فلاح و بہبود کا تمام تر انحصار عدل و انصاف کے تقاضوں کی مکمل پاسداری پر ہی ہے۔ لہذا بندے اگر باہم انصاف کو قائم رکھیں گے تو یہ نظام کائنات بھی بدستور جاری و ساری اور رواں دواں رہے گا۔ لیکن اگر بندوں نے انصاف کا خون کر ڈالا تو یہ نظام کائنات بھی تہ و بالا اور درہم برہم ہو جائے گا، لہذا قانون قدرت یہی ہے کہ خواہ کوئی چھوٹا سا گھریا جھونپڑی ہو، کوئی محل یا حویلی ہو، کوئی کارخانہ یا فیکٹری ہو، کوئی ادارہ یا کمپنی ہو، کوئی مملکت یا عظیم الشان سلطنت ہو، جب تک وہاں انصاف کا بول بالا رہے گا اُس وقت تک وہاں خیر و خوبی اور عافیت و سلامتی رہیگی۔ لیکن جب انصاف کے تقاضوں کی پامالی شروع ہو جائیگی تو پھر وہاں جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی ضرورتاً ہی ویربادی آکر ہی رہے گی، اور پھر کچھ بھی نہیں بچے گا، سبھی کچھ جل کر خاکستر ہو جائے گا، اور پھر جب اس دنیا میں ظلم و ستم اور حق تلفی و نا انصافی کا سلسلہ حد سے بڑھ جائیگا تب آخر کار قیامت برپا ہو جائیگی اور تمام کائنات ہی کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا (۱) کیونکہ خالق کائنات نے اس کائنات کی بنیاد ہی ”انصاف“ پر رکھی ہے

(۱) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ”علامات قیامت“ کے تذکرہ میں ایک علامت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ:

(يَمُرُّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي مَكَانَهُ) (بخاری [۶۶۹۸] کتاب الفتن، باب: لا تقوم الساعة حتى يغبط أهل القبور) ”یعنی انسان کسی قبر کے قریب سے گزرتے وقت یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس قبر میں موجود اس مردے کی جگہ میں دفن ہوتا۔“

مقصود یہ کہ ظلم و ستم اور زیادتی و نا انصافی کا سلسلہ اس قدر بڑھ چکا ہوگا کہ انسان موت کی تمنا کرے گا، قبر میں پڑے ہوئے مردے کو خوش نصیب اور خود کو بد نصیب تصور کریگا۔

یہی مفہوم ہے اس ارشادِ بانی کا: ﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ (۱) ترجمہ: (اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی، تاکہ تم تولنے میں تجاوز نہ کرو) یعنی تولنے میں انصاف سے تجاوز نہ کرو۔

☆..... نیز قرآن کریم میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اور ان کی طرف آسمانی کتابوں کے نزول کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک مقصد ”اقامتِ عدل“ بھی ہے، جیسا کہ اس ارشادِ بانی میں اسی بات کا تذکرہ ہے: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (۲) ترجمہ: (یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیل دے کر بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان [ترازو] نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں)

نیز قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان میں عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے، یقیناً اللہ پسند فرماتا ہے عدل کرنے والوں کو)

نیز ارشاد ہے: ﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ﴾ (۴) ترجمہ: (آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ﴾ (۵) ترجمہ: (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم میں انصاف کرتا رہوں)

☆..... ”عدل و انصاف“ کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن و حدیث میں بار بار زندگی کے ہر معاملے میں عدل و انصاف کو قائم کرنے، نیز ظلم و زیادتی اور حق تلفی و نا انصافی سے اجتناب کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۱)  
ترجمہ: (اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ (۲)  
ترجمہ: (اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۳)  
ترجمہ: (اور انصاف کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ (۴) ترجمہ: (اے ایمان والو! عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور اللہ کی خوشنودی کیلئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ یا عزیزوں رشتے داروں کے خلاف ہو)

یعنی اہل ایمان کو اس بات کا حکم دیا جا رہا ہے کہ ہمیشہ سچی اور عدل و انصاف پر مبنی بات کہا کریں، خواہ بظاہر وہ بات خود اپنے ہی خلاف ہو، یا اس میں بظاہر خود اپنے لئے یا اپنے والدین یا عزیز و احباب کیلئے کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔

نیز ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾ (۵) ترجمہ: (اور جب تم بات کرو تو انصاف کرو، گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو)

☆..... یہاں تک کہ قرآن کریم میں کفار و مشرکین اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ بھی ”اقامتِ عدل“ کی تاکید کی گئی ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا ۖ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ، کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کر دے، عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے)

یعنی اس آیت میں دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے اصولوں اور تقاضوں کی مکمل رعایت و پاسداری کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اللہ سے ڈرتے رہنے کی تاکید بھی کی گئی ہے، اور یہ بات بھی یاد دلادی گئی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ بندوں کے تمام اعمال سے (جن میں اقامتِ عدل یا اس کے برعکس ظلم زیادتی اور حق تلفی بھی شامل ہے) خوب باخبر ہے۔

☆..... یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قرآن وحدیث میں اقامتِ عدل کی یہ اس قدر تاکید و تلقین محض کسی مخصوص طبقے کیلئے نہیں ہے، بلکہ یہ تاکید و تلقین ہر انسان کیلئے ہے، کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی درجہ میں صاحبِ قدرت اور صاحبِ اختیار ہے۔

☆..... چنانچہ اگر کوئی بادشاہ یا حکمران اور سربراہِ مملکت ہے، تو اس کیلئے بھی عدل و انصاف کے تقاضوں کی مکمل رعایت و پاسداری بہر صورت ضروری و لازمی ہے، بلکہ عادل بادشاہ کیلئے تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بہت بڑی خوشخبری ہے۔

چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے: (سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: الْإِمَامُ الْعَادِلُ.....) (۱) ترجمہ: (سات قسم کے افراد ایسے ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بطورِ خاص سایہ میں جگہ عطا فرمائیں گے جبکہ اُس روز اس کے سوا اور کہیں کوئی سایہ نہیں ہوگا: انصاف کرنے والا بادشاہ.....)

یعنی قیامت کے روز جب سورج انتہائی قریب آچکا ہوگا اور اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ لوگوں کے سروں پر آگ برسا رہا ہوگا، گرمی کی حدت و شدت کی وجہ سے لوگوں کا برا حال ہوگا اور سب ہی لوگ انتہائی پریشانی کے عالم میں ہوں گے، لوگ پسینوں میں شرابور ہو رہے ہوں گے، بلکہ بہت سے لوگ تو پسینوں میں غرق ہو رہے ہوں گے..... اس قدر تکلیف دہ اور جان لیوا صورتِ حال میں کچھ ایسے خوش نصیب افراد بھی ہوں گے جنہیں اس روز اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے بطورِ خاص سایہ میں جگہ دی جائیگی، جبکہ اس روز تمام کائنات اور زمین و آسمان میں اس کے سوا اور کہیں کوئی سایہ نہ ہوگا، اور پھر خاص طور پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ سات قسم کے افراد جن کا اس حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے، جنہیں اُس روز اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے بطورِ خاص سایہ میں جگہ عنایت کی جائیگی، ان میں سے سب سے پہلے ”عادل بادشاہ“ کا تذکرہ ہے۔ جس سے یقیناً بادشاہ اور حکمران کیلئے ”عدل و انصاف“ کی ضرورت و اہمیت واضح ہوتی ہے، نیز اس سے ”عادل بادشاہ“ کا مقام و مرتبہ اور ”عدل و انصاف“ کی ضرورت و اہمیت بھی واضح و ثابت ہوتی ہے۔

☆..... حکمران، یا سربراہ مملکت ہی کے مفہوم میں ہر وہ شخص بھی شامل ہے جو کسی بھی ادارے کا سربراہ یا سرپرست ہو، یا جس کی زیر نگرانی یا سرپرستی کچھ لوگ کوئی کام کاج

(۱) بخاری [۶۲۹] باب من جلس فی المسجد یظفر الصلاۃ و فضل المساجد۔ نیز [۱۳۵۷] باب اذا اصدق علیہم و ہولاء یشر۔ نیز: مسلم [۱۰۳۱] باب فضل اخفاء الصدقة۔



انجام دینے پر مامور ہوں، چنانچہ ایسے ہر شخص کیلئے بھی اپنے ماتحت عملہ کے تمام افراد کے درمیان عدل و انصاف کے تقاضوں کی مکمل رعایت و پاسداری ضروری و لازمی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.....) (۱) ترجمہ: (یاد رکھو! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے، اور ہر شخص اپنی رعیت کے بارے میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہے.....)

یعنی خواہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، کسی ملک و قوم کا سربراہ اور بادشاہ ہو یا چرواہا اور گلہ بان، امیر و کبیر اور سرمایہ دار ہو یا غریب مزدور اور کسان..... ہر شخص کسی نہ کسی درجہ میں ذمہ دار اور نگہبان ہے، اور اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔

☆..... اسی طرح ہر انسان کیلئے اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف سے کام لینا اور ہر قسم کی نا انصافی سے مکمل اجتناب انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ بچے اگر اپنے والدین کو نا انصافی کرتے ہوئے دیکھیں گے تو اپنی آئندہ زندگی میں شاید وہ خود بھی اسی برائی کو اپنائیں، جس کا یقینی نتیجہ ان کیلئے دنیا و آخرت میں خسارہ و بربادی ہی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

نیز یہ کہ بچوں کو اگر خود اپنے والدین سے ہی انصاف نہ مل سکے تو پھر انہیں دنیا میں اور کہاں انصاف مل سکے گا اور اس دنیا میں ان سے بڑھ کر محروم و بدنصیب اور کون ہوگا.....؟ یقیناً یہ کتنا بڑا المیہ ہوگا اور خود والدین کے ہاتھوں اپنے بچہ کو گوشوں پر یہ کس قدر ظلم عظیم ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ کہ والدین کی طرف سے نا انصافی کے نتیجے میں بچوں میں باہم حسد اور نفرت و عداوت وغیرہ جیسے انتہائی مہلک اور خطرناک قسم کے جذبات اور بدترین روحانی و اخلاقی امراض پیدا ہونے لگتے ہیں اور ان کے دلوں میں انتقام کا ایک آتش فشاں جوش مارتا رہتا

(۱) بخاری، باب: الجمعة فی القری والمدن [۸۵۳] نیز: باب اذا اتاه خادمه بطعام [۲۳۱۹] نیز: باب قوا انفسکم وابلکیم ناراً [۴۸۹۲] نیز: کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم [۶۷۱۹]

ہے، جو کہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے اور اُبلتے اور دھکتے ہوئے لاوے کی شکل میں وہ گھریا بلکہ تمام خاندان کو تباہ و برباد کر سکتا ہے، قدرت کے بنائے ہوئے مقدس و نازک ترین رشتوں کو ہمیشہ کیلئے جلا کر خاکستر اور نیست و نابود کر سکتا ہے۔

لہذا انسان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ اپنے بچوں میں باہم شکل و صورت، نقوش، یارنگت کی بناء پر کسی قسم کی تفریق، یا بیٹے اور بیٹی میں اپنے رویہ و سلوک، پیار و محبت، ہدیہ و تحفہ، مالی انعام و اکرام، یا اور کسی بھی معاملہ میں کسی بھی قسم کی اونچ نیچ، کمی بیشی یا تمیز و تفریق کے ذریعہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے غضب کو دعوت نہ دے، اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے لئے دنیا و آخرت میں بد بختی و بربادی کا سامان نہ کرے، اور اللہ کی دی ہوئی عقل اور ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے ذرہ اس بارے میں غور و فکر کرے کہ خوبصورتی یا بد صورتی، کالا یا گورا ہونا، لڑکا یا لڑکی ہونا..... یہ سب کچھ بچوں کے اپنے اختیار میں تو نہیں ہے، یہ سب تو محض اللہ کی طرف سے ہے، جس کی مشیت و مرضی کے سامنے چھوٹے بڑے، امیر و غریب، بادشاہ و فقیر سب ہی مجبور و بے بس ہیں.....، تو پھر محض ان اسباب کی بناء پر اپنے بچوں کے ساتھ پیار و محبت اور رویہ و سلوک میں تفریق و امتیاز برتنا اور نا انصافی کی راہ اپنانا کہاں کی دانشمندی ہے.....؟

☆..... قرآن و حدیث میں اقامتِ عدل کی تاکید و تلقین کے ساتھ ساتھ ”ظلم“ کی مذمت بیان کی گئی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر معاملہ میں اس سے مکمل اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: (يَا عِبَادِي اِنِّي حَرَمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِيْ، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالُمُوْا) ترجمہ: اے میرے

بندو! میں نے ”ظلم“ کو خود اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا ہے، اور تمہارے لئے بھی میں نے اسے حرام ہی قرار دے دیا ہے، اس لئے تم بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو (۱) نیز قرآن وحدیث میں بار بار یہ ”قانونِ قدرت“ یاد دلایا گیا ہے کہ ظلم و نا انصافی اور حق تلفی و زیادتی قوموں کی تباہی و بربادی کا اہم ترین سبب ہے۔ لہذا وہ کوئی ملک ہو یا ادارہ، کوئی گھر ہو یا کارخانہ، جہاں ظلم و زیادتی ہوگی، وہاں ضرور تباہی و بربادی آ کر رہی رہیگی، وہ بستی ضرور کھنڈر بنے گی، وہ آبادی ضرور ویرانے میں تبدیل ہوگی اور آئندہ نسلوں کیلئے سامانِ عبرت بن جائے گی، وہ گھر ضرور اچڑ جائے گا، وہاں کی خوشیاں ضرور غموں میں، اور مسکراہٹیں ضرور آہوں اور سسکیوں میں بدل کر رہیں گی.....! یہی قانونِ قدرت ہے، جسے کوئی بدل نہیں سکتا.....!!

چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا﴾ (۲) ترجمہ: (یہ ہیں وہ بستیاں جنہیں ہم نے ان کے مظالم کی بناء پر غارت کر دیا اور ان کی تباہی کی بھی ہم نے ایک میعاد مقرر کر رکھی تھی) اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور بہت سی بستیاں ہم نے تباہ کر دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو پیدا کر دیا)

نیز ارشاد ہے: ﴿فَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فِيهَا خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبُئِرَ مُعَطَّلَةٌ وَقَصْرٌ مَشِيدٌ﴾ (۴) ترجمہ: (بہت سی بستیاں ہیں جنہیں

[۳] الانبیاء [۱۱]

[۲] الکہف [۵۹]

[۱] مسلم [۲۵۷۷] ابن حبان [۶۱۹] احمد [۲۱۴۵۸]

[۴] الحج [۲۵]

ہم نے تہ وبالا کر دیا، اس لئے کہ وہ ظالم تھے، پس وہ اپنی چھتوں کے بل اوندھی ہوئی پڑی ہیں، اور بہت سے آباد کنوئیں بیکار پڑے ہیں، اور بہت سے بچے اور بلند محل ویران پڑے ہیں)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةٌ بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (یہ ہیں ان کے مکانات جو ان کے ظلم کی وجہ سے خالی پڑے ہیں، جو لوگ علم رکھتے ہیں ان کیلئے اس میں بڑی نشانی ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ (۲) ترجمہ: (تیرے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جب کہ وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے، بیشک اس کی پکڑ دردناک اور نہایت سخت ہے)

غور طلب بات ہے کہ گزشتہ تمام آیات میں ان گزشتہ اقوام میں سے ہر ایک کی تباہی و بربادی اور ان کے گھروں کے اجڑ جانے کا سبب یہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ ”ظالم“ تھے۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ذہنوں میں رہنا چاہئے: (اتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حَبَابٌ) (۳) ترجمہ: (مظلوم کی بددعا سے ڈرو، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے)

(۱) النمل [۵۲] (۲) ہود [۱۰۲]

(۳) ☆ بخاری [۱۲۴۵] باب أَخْذُ الصَّدَقَاتِ مِنَ الْأَغْنِيَاءِ وَتَرْدِي الْفُقَرَاءِ ..... نیز: [۱۲۲۳] باب غَنَاءُ الْمَظْلُومِ - نیز: [۴۰۹۰] باب بَعَثَ أَبِي مُوسَى وَمَعَاذِ بْنِ جَبَلِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا إِلَى الْيَمَنِ ..... ☆ مسلم [۱۹] باب الدَّعَاءُ إِلَى الشُّهَادَةِ وَتَرْائِعِ الْإِسْلَامِ - ☆ ابن حبان [۵۰۸۱] ☆ ابن ماجہ [۱۷۸۳] باب فَرَضَ الزَّكَاةَ، ☆ ترمذی [۶۲۵] وغيرہ۔ البتہ کسی روایت میں: فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حَبَابٌ، کسی میں: فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللَّهِ حَبَابٌ، اور کسی میں: فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حَبَابٌ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

☆..... ”ظالموں“ کیلئے دنیا میں اس تباہی و بربادی اور پھر اس دنیاوی عذاب کے علاوہ مزید یہ کہ آخرت میں بھی ان کا برا انجام، ان کیلئے غضبِ خداوندی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ان کیلئے لعنت اور برا ٹھکانہ ان کا منتظر ہے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذَرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾ (۱) ترجمہ: (جس دن ظالموں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی، ان کیلئے لعنت ہی ہوگی، اور ان کیلئے برا گھر ہوگا)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿..... فَأَذِّنْ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (۲) ترجمہ: (..... پھر ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ: ”اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر“)

نیز ارشاد ہے: ﴿الْأَلْعَنَةُ لِلَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر)

نیز ارشاد ہے: ﴿مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ﴾ (۴) ترجمہ: (ظالموں کا نہ کوئی دلی دوست ہوگا نہ کوئی سفارشی کہ جس کی بات مانی جائے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَرْكُنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ﴾ (۵) ترجمہ: (دیکھو! ظالموں کی طرف ہرگز نہ جھکنا، ورنہ تمہیں بھی [دوزخ کی] آگ لگ جائیگی، اور تب اللہ کے مقابلہ میں تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا اور نہ تم مدد کئے جاؤ گے) یعنی قرآن کریم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کیلئے ظالموں کے ساتھ تعلق اور دوستی، ان کی صحبت و ہم نشینی، اور ان کی طرف

(۳) ہود [۱۸]

(۲) الاعراف [۴۴]

(۱) غافر مؤمن [۵۲]

(۵) ہود [۱۱۳]

(۴) غافر مؤمن [۱۸]

رغبت و میلان کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الظُّلُمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) (۱)

ترجمہ: ”ظلم، قیامت کے روز اندھیروں کا سبب بن جائے گا)

یعنی قیامت کی ہولناکیوں میں جب انسان کو ”نور“ یعنی روشنی کی اشد ضرورت ہوگی، ایسے میں اہل ایمان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے نور عطاء کیا جائے گا (۲) جب کہ کفار و منافقین اس روز اندھیروں میں بھٹکتے پھر رہے ہوں گے۔

اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے اپنی دنیاوی زندگی میں عدل و انصاف سے کام لینے کی بجائے ظلم و نا انصافی کو اپنا شیوہ و شعار بنائے رکھا ان لوگوں کا بھی یہی حال ہوگا، یعنی روز قیامت وہ بھی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہوں گے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس دنیا میں کسی ظالم انسان کی طرف سے دوسروں کے ساتھ روا رکھا جانے والا ہر ایک ایک ظلم صرف ایک تاریکی کا ہی سبب نہیں بنے گا بلکہ اس کا ہر ایک ”ظلم“ وہاں اس کیلئے ”ظلمات“، یعنی بہت سی ظلمتوں، تاریکیوں اور اندھیروں کا سبب بن جائیگا.....!!

☆ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ مَظْلَمَةٌ لِأَخِيهِ مِنْ

عَرْضِهِ أَوْ مِنْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ لَا يَكُونَ دِينَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ، إِنْ

(۱) ☆ بخاری [۲۳۱۵] باب: الظلم ظلمات يوم القيامة - ☆ مسلم [۲۵۷۸] نیز: [۲۵۷۹]

☆ ابن حبان [۵۱۷۶] ذکر الزجر عن الظلم والفحش والفسخ - ☆ الترمذی [۳۰۲۰] باب ماجاء فی الظلم -

☆ احمد [۵۸۳۲] [۶۲۱۰] [۶۴۴۶] [۶۴۸۷] [۶۷۹۲] [۶۸۳۷] [۹۵۶۵] [۱۴۵۰۱] -

(۲) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ

أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ .....﴾ ترجمہ: (اس دن تو دیکھے گا کہ ایمان دار مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے آگے

اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا.....) (الحمدید: ۱۲)

كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدَرٍ مَظْلَمَتِهِ ، وَ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتٍ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ ) (۱) ترجمہ: (جس کسی نے اپنے کسی بھائی پر کوئی ظلم و زیادتی کی ہو خواہ اس کا تعلق عزت و آبرو سے ہو یا اور کسی بھی قسم کی زیادتی ہو وہ اس کے ساتھ اپنا معاملہ اُس دن کی آمد سے قبل صاف کر لے کہ جس دن کسی کے پاس [تصفیہ حساب کیلئے] نہ کوئی درہم ہوگا اور نہ کوئی دینار، تب اس ظالم کے پاس اگر کچھ نیکیاں ہوں گی تو ان میں سے اس کی زیادتی کی مقدار کے برابر اُس مظلوم کو دے دی جائیں گی، اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں تو اُس مظلوم کی برائیاں اِس پر لاد دی جائیں گی)

☆ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ایک بار اپنے اصحاب سے دریافت فرمایا: (أَتَذَرُونَ مَنْ الْمُفْلِسُ؟) یعنی: (کیا تم جانتے ہو کہ ”مفلِس“ کون ہے؟) (قَالُوا: الْمُفْلِسُ فِينَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ وَلَا مَتَاعَ) عرض کیا گیا کہ: (ہم میں سے مفلس شخص وہ ہے جس کے پاس نہ کوئی روپیہ پیسہ ہو اور نہ ہی کوئی مال و اسباب ہو) (فَقَالَ: الْمُفْلِسُ مِنْ أُمَّتِي مَنْ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَ صِيَامٍ وَ زَكَاةٍ ، وَيَأْتِي وَقَدْ شَتَمَ هَذَا ، وَقَذَفَ هَذَا ، وَأَكَلَ مَالَ هَذَا ، وَسَفَكَ دَمَ هَذَا ، وَضَرَبَ هَذَا ، فَيُعْطَى هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ ، وَ هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْضَىٰ مَا عَلَيْهِ أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ ، فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ، ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ) (۲) تب آپ نے فرمایا: ”مفلِس تو میری امت میں سے وہ شخص ہے جو کہ قیامت کے روز [اپنے نامہ اعمال میں] بہت سی نمازیں، روزے، اور زکوٰۃ لے کر آئے گا،

(۱) بخاری [۲۳۴۹] مسلم [۲۵۸۱] کتاب البر والصلة والآداب ☆ ترمذی [۲۴۱۸] باب ما جاء في

شأن الحساب والقصاص ☆ احمد [۸۰۱۶] [۸۳۹۵] [۸۸۲۹] وغیرہ۔

مگر اس نے [دنیا میں] کسی کو گالی بکی ہوگی، کسی پر گناہ کی کوئی تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال ناحق دبا یا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، اور کسی کو زد و کوب کیا ہوگا..... تب اس کے تمام اچھے اعمال ان [مظلوموں] میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ اگر اس کی تمام نیکیاں ختم ہو گئیں، مگر دعویدار ختم نہ ہوئے، تو ایسے میں ان سب کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے، اور پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا)

☆..... خالق کائنات کے نزدیک ”عدل و انصاف“ کی اہمیت اور ”ظلم و زیادتی“ کی قباحت و شناعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ قیامت کے روز انسانوں کے علاوہ حیوانات تک میں باہم ظلم و زیادتی کے معاملات کا تصفیہ کیا جائے گا، چنانچہ ایسے تمام جانوروں کو زندہ کیا جائیگا، اور ان میں سے جس کسی پر جو ظلم ہوا ہوگا اس کے ساتھ انصاف کیا جائیگا اور اسے ظالم سے بدلہ نیز اس کا حق دلایا جائے گا، کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری پر زیادتی کی ہوگی تو اسے بھی اس زیادتی کا بدلہ دلایا جائیگا، اس کے بعد ان حیوانات کو کہا جائے گا: (کُونِی تَرَابًا) یعنی: ”اب تم دوبارہ خاک ہو جاؤ“۔ جس پر وہ حیوانات دوبارہ مرجائیں گے اور خاک میں مل جائیں گے (۱)

☆..... لہذا اس فانی دنیا میں محض عارضی و فانی مفادات کی خاطر دوسروں کی حق تلفی کرنے والوں اور ظلم و زیادتی کی راہ اپنانے والوں کو اس بارے میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہئے، ایسے افراد کو اپنے آپ پر رحم کرنا چاہئے اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے لئے قبر

(۱) تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ ہو: ﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تَرَابًا﴾ (سورۃ الباقہ: ۴۰) نیز مسند امام احمد میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ملاحظہ ہو: (إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ جَالِسًا وَشَاتَانِ تَقْتَرِنَانِ فَنَطَخَتْ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى.....) احمد [۲۱۵۵۰] نیز مسند احمد میں ہی ملاحظہ ہو: (إِنَّ الْجَمَاءَ لَتَقْصَّ مِنَ الْقِرْنَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) احمد [۵۲۰]



اور حشر میں تاریکیوں کا سامان جمع کرتے رہنے سے باز آ جانا چاہئے۔

☆..... عدل و انصاف کی ضرورت و اہمیت کے بیان میں ہی ہر انسان کیلئے اس بات کو خوب سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اسے خود اپنے ساتھ بھی انصاف سے کام لینا چاہئے اور شرک، بدعات، خرافات، سینات و منکرات، ہر قسم کے فاسد و باطل اعتقادات، لغو و بے ہودہ افکار و خیالات، نیز ہر قسم کی معصیت و ضلالت اور اپنے خالق و مالک کی نافرمانی سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ پر ظلم و ستم اور نا انصافی و زیادتی سے باز رہنا چاہئے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں شرک کی ملاوٹ نہیں کی انہی کیلئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

☆..... قرآن کریم میں ”شرک“ کو ”ظلم عظیم“ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (۲) ترجمہ: (بیشک شرک تو بڑا ہی بھاری ظلم ہے)

قرآن کریم میں جا بجا کفار و منافقین و دیگر گناہگاروں اور نافرمانوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ دنیا میں غلط عقائد و خیالات کو اپنا کر، نیز اللہ کی نافرمانی کر کے یہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے۔

مثلاً ایک مقام پر ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ.....﴾ (۳) ترجمہ: (ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ خود انہوں نے ہی اپنے آپ پر ظلم کیا.....)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ﴾ (۴) ترجمہ: (ہم

نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی ظالم تھے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ (۱)  
ترجمہ: (اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرے، بلکہ یہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے  
تھے)

نیز ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ  
يَظْلِمُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (یقیناً اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود ہی اپنی جانوں  
پر ظلم کرتے ہیں)

نیز قرآن کریم میں ”قوم سب“ کی طرف سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نافرمانی و روگردانی کے  
تذکرے کے بعد ارشاد ہے: ﴿وَوَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَرَّقْنَاهُمْ  
كُلَّ مُمَرَّقٍ﴾ (۳) ترجمہ: (اور انہوں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا اس لئے ہم نے  
انہیں گزشتہ فسانوں کی صورت میں کر دیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے)

☆..... یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کردہ عقل اور شعور کی بدولت انسان جب  
بدی اور نیکی، خیر اور شر کو خوب جان چکا اور پہچان چکا، تو اب اس کیلئے ضروری ہے کہ خود پر رحم  
کرے اور اپنی حالت پر ترس کھائے، اپنے عقیدہ و ایمان کی اصلاح کی فکر و جستجو کرتا رہے،  
اپنے افکار و خیالات کو پاکیزہ رکھے، اپنے خالق و مالک کی رضامندی و خوشنودی کا راستہ  
اختیار کرے، اس کی معصیت و نافرمانی سے اپنا دامن بچائے رکھے، خود اپنے ہی ہاتھوں  
اپنے آپ پر ظلم و زیادتی سے باز رہے، گوشت پوست کے بنے ہوئے اپنے اس کمزور  
و ناتواں اور خاکی وجود کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں نہ جھونکے.....!!

## ”رحمدلی و مہربانی“

رحمدلی، مہربانی، ہمدردی، یہ مؤمن کی خاص صفت اور نشانی ہے، قرآن وحدیث میں جا بجا اس کی تلقین و تاکید کی گئی ہے، اس کی ترغیب دی گئی ہے، اور اس صفت کے حامل افراد کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے، جبکہ اس کے برعکس سنگدلی و تلخ مزاجی کی مذمت کی گئی ہے، اور اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ رحمدلی ایمان، نیک بختی وسعادت مندی کی علامت ہے، جبکہ سنگدلی نفاق اور بد بختی کی علامت ہے، چنانچہ تاریخ عالم گواہ ہے کہ اہل حق کو جب بھی فتح و کامیابی اور غلبہ نصیب ہوا تو انہوں نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخ دلی اور حسن سلوک سے کام لیا، جبکہ اہل باطل کو جب بھی موقع ملا انہوں نے ہمیشہ بے رحمی، سنگدلی اور بربریت کا مظاہرہ کیا، مخالفین کے ساتھ وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اور انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے، مسلمانوں کے ساتھ مشرکین مکہ کی بدسلوکیوں اور مظالم کی طویل داستان اور اس کے جواب میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ان کے ساتھ حسن سلوک اور عام معافی کا اعلان اس بات کی بہترین مثال اور اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ”رحمدلی و مہربانی“ کی اہمیت کو سمجھنے کیلئے درج ذیل امور قابل غور و فکر ہیں:

☆ اللہ رحیم ہے:

مؤمن کے دل میں رحم کے جذبات اللہ پر ایمان کی وجہ سے ہیں، کیونکہ اللہ خود رحیم و کریم ہے، قرآن کریم میں اللہ کی صفت رحمت کا بار بار بیان و تذکرہ ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾

(۱) ترجمہ: (وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جاننے والا ہے اس چیز کا جو غائب ہے اور جو حاضر ہے، وہ انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۲) ترجمہ: (اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور کہو کہ اے میرے رب! تو بخش دے اور رحم فرما، اور تو سب مہربانوں سے بہتر مہربانی کرنے والا ہے)

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورت کی ابتداء ہی ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سے کی گئی ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ رحمت ہیں:

قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۴) ترجمہ: (اور ہم نے تو آپ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

☆ قرآن رحمت ہے:

ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ تَكْمٌ مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵) ترجمہ: (اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے، اور دلوں میں جو روگ

(۱) الحشر [۲۲] (۲) الاعراف [۱۵۶] (۳) المؤمنون [۱۱۸] (۴) الانبیاء [۱۰۷] (۵) یونس [۵۷]

ہیں ان کیلئے شفاء ہے، اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کیلئے)

☆ جنت رحمت ہے:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وَجُوهُهُمْ فَبِإِذْنِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور سفید چہروں والے اللہ کی رحمت [جنت] میں داخل ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے)

☆ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کیلئے رحمت ہیں:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ، وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ﴾ (۲) ترجمہ: (محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحمدل ہیں)

لہذا یہ بات قابل غور ہے کہ اس مؤمن کے دل میں جس اللہ پر ایمان ہے وہ رحیم و کریم ہے، جس نبی ﷺ پر ایمان ہے اور ہر مؤمن روز قیامت ان کی شفاعت کی تمنا اپنے دل میں لئے بیٹھا ہے وہ نبی بھی رحمت ہیں، جس قرآن پر ایمان ہے اور جسے اس نے سینے سے لگا رکھا ہے وہ قرآن بھی رحمت ہے، جس جنت میں داخلے کی آرزو ہے وہ بھی رحمت ہے، مگر اس کے باوجود اس کا اپنا دل رحمت و ہمدردی کے جذبات سے خالی ہو...؟ یہ کس طرح ممکن ہے؟

مسلمان جب ہوش سنبھالتا ہے اسی وقت سے ہی نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہے، زندگی بھر وہ روزانہ پانچ نمازیں پڑھتا ہے، ہر نماز میں بہت سی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت کے شروع میں وہ ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ پڑھتا ہے، اس کے بعد ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھتا

ہے اور اس میں دوبارہ ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ پڑھتا ہے، لہذا ایک شخص جو زندگی بھر روزانہ اللہ کے بارے میں بار بار یہ الفاظ و کلمات اپنی زبان سے دہراتا ہو اور پھر بھی اس کا اپنا دل رحم سے خالی و محروم ہو..... یہ کس قدر عجیب بات ہے، مسلمان جو روزانہ دن میں پانچ بار اللہ کے سامنے سر جھکائے اور ہاتھ باندھے ہوئے اس سے دعاء و فریاد کرتا ہے اور اس کی رحمت سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے رکھتا ہے، اگر خود اس کا اپنا دل خلق خدا کیلئے رحمت و ہمدردی کے جذبات سے خالی و عاری ہو اور بندگانِ خدا کے ساتھ اس کا اپنا رویہ و سلوک اچھا نہ ہو تو یقیناً یہ بہت ہی بڑی محرومی و بد بختی ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمَهُ اللَّهُ) (۱)

(ترجمہ: جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا)

اسی طرح ارشاد ہے: (لَا تَنْزَعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ) (۲) (ترجمہ: رحمت و مہربانی [کے جذبات] سے صرف وہی شخص محروم ہوتا ہے جو بد بخت ہو)

نیز ارشاد ہے: (إِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى الْقَلْبُ الْقَاسِي) (۳)

(ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ [کی رحمت] سے سب سے زیادہ دور اور محروم رہنے والا شخص وہ ہے جس کا دل سخت ہو)

اسی طرح ارشاد ہے: (الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ، اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ

(۱) مسلم [۲۳۱۹] ابن حبان [۴۶۵] [۴۶۷] ☆ ترمذی [۱۹۲۲] باب ماجاء فی رحمة المسلمین۔

☆ نیز: ترمذی [۲۳۸۱] باب ماجاء فی الرياء والسمعة۔ ☆ یہی حدیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہے، البتہ اس میں الفاظ یہ ہیں: (لَا يَرْحَمُ اللَّهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ) [۶۹۴۱] باب: قول اللہ تعالیٰ: قُلْ ادْعُوا اللَّهَ أَدْعُوا

الرَّحْمَنُ..... (۲) ترمذی [۱۹۲۳] باب ماجاء فی رحمة المسلمین۔ نیز: ابوداؤد [۴۹۴۲]

(۳) ترمذی [۲۳۱۱] باب ماجاء فی حفظ اللسان۔

يَرْحَمُكُم مِّنْ فِي السَّمَاءِ) (۱) (ترجمہ: رحمن انہی پر رحم فرماتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہوں، تم زمیں والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا)

ایک بار جب رسول اللہ ﷺ کی ایک صاحبزادی کے کمسن بچے کی طبیعت خراب تھی اور صورتِ حال کافی تشویشناک تھی.....

تب آپ ﷺ نے اس بچے کو اپنی گود میں لیا، اُس وقت بچے کی سانس اُکھڑ رہی تھی اور نزاع کے کچھ آثار نمایاں تھے..... یہ منظر دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، وہاں موجود افراد میں سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے قدرے تعجب اور حیرت کے انداز میں آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ: یا رسول اللہ! آپ بھی.....؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اِنَّمَا هِيَ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللَّهُ فِي قُلُوبِ عِبَادِهِ، وَ اِنَّمَا يَرْحَمُ اللَّهُ مِنَ عِبَادِهِ الرَّحِمَاءُ) (۲)

(۱) ترمذی [۱۹۲۴] باب ماجاء فی رحمۃ المسلمین ☆ احمد [۶۴۹۴] ☆ ابوداؤد [۴۹۴۱] باب فی الرحمۃ۔

(۲) ☆ بخاری [۱۲۳۴] باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یعذب لیت بکاء بعض اہلہ علیہ.....

امام نووی نے یہ حدیث ریاض الصالحین میں ”باب الصبر“ میں ذکر کی ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب ہوگا کہ ظن غالب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں، مزید یہ کہ یہ ان کا یہ کون سا کم سن بچہ تھا.....؟ بیٹا تھا یا بیٹی تھی..... اور پھر یہ کہ اس موقع پر اس کی وفات ہو گئی؟ یا یہ کہ وہ زندہ بچ گیا تھا.....؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ملاحظہ ہو: دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین، باب الصبر، ج: ۱، ص: ۱۸۲۔

☆ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض روایات میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: ”هذه رَحْمَةٌ وَضَعَهَا اللَّهُ فِي قُلُوبِ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادِهِ“ (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری [۵۳۳۱] باب عیادۃ الصبیان) یعنی: ”یہ تو رحم کے جذبات ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے“۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ رحمت و ہمدردی کے جذبات ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے، بلکہ یہ نعمت تو صرف انہی خوش نصیبوں کو ہی نصیب ہوتی ہے جنہیں خود اللہ تعالیٰ اپنی اس نعمت کیلئے منتخب فرماتے ہیں۔

یعنی: ”یہ آنسو تو اس رحمت کی علامت ہیں جو کہ اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دی ہے، اور اللہ اپنے بندوں میں سے انہی پر رحم فرماتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔“

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے کسمن صاحبزادے ابراہیم نے جب آپ کی گود مبارک میں آخری ہچکی لی تو اس موقع پر بھی آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، جس پر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حیرت و تعجب کے طور پر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ بھی.....؟ تب آپ نے فرمایا کہ: (یا ابن عوف! انہا رحمة.....) یعنی: ”اے ابن عوف! یہ آنسو تو رحمت کی علامت ہیں.....“ (۱)

### ☆ کمزوروں کے ساتھ رحمدلی و مہربانی کی خصوصی تاکید:

معاشرے میں موجود کمزور افراد نیز کمزور طبقات کے ساتھ حسن سلوک، رحمدلی، ہمدردی و مہربانی اور ان کی خبر گیری کی خاص طور پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اس بارے میں مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

### ☆ ضعیف والدین:

اس سلسلے میں سب سے پہلے والدین کا حق اور مقام و مرتبہ ہے، چنانچہ والدین کے ساتھ تو ہمیشہ اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ہی حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، لیکن جب وہ عمر رسیدہ اور ضعیف ہو جائیں تو اس وقت ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کیلئے رحمدلی و مہربانی کی خاص طور پر بہت زیادہ تاکید ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَفٍّ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾ (۲)

(۱) بخاری [۱۲۳۱] باب الصبر عند الصدمة الاولى۔ (۲) بنی اسرائیل الاسراء [۲۳-۲۴]



ترجمہ: (اور تیرا رب صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، اگر تیری موجودگی میں ان میں سے کوئی ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کہنا، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا، بلکہ ان کے ساتھ ادب و احترام سے بات چیت کرنا، اور عاجزی و محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا بازو پست رکھے رکھنا، اور دعاء کرتے رہنا کہ: ”اے میرے رب! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے“۔)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں اولاً تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیز ان کیلئے دعاء مانگتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ کہ اللہ کی طرف سے دعاء بھی خود ہی سکھا دی گئی، پھر مزید یہ کہ اس دعاء میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے جس سے انسان کو اپنے بچپن کا دور یاد آ جائے، اور انسان چشم تصور سے اس منظر کو دیکھے جب وہ کمزور و ناتواں تھا، اٹھنے بیٹھنے کی سکت بھی نہیں تھی، کھانے پینے، جسمانی صفائی وغیرہ وغیرہ تمام معاملات میں اسے والدین کی مکمل احتیاج تھی، والدین ہمیشہ ہنسی خوشی اس کی تمام ضروریات پوری کرتے رہے، خود رکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا مگر اس کیلئے عمدہ خوراک کا انتظام کیا، خود جو لباس میسر آیا زیب تن کر لیا مگر اس کیلئے حتی المقدور مناسب پوشاک کا بندوبست کیا، اگر کبھی وہ بیمار پڑ جاتا تو اس کے والدین انتہائی بیتابی و بیقراری کے عالم میں رات بھر اس کے سر ہانے کھڑے رہتے مگر اف تک نہ کرتے، اور پھر صبح ہونے پر بچہ اگر ایک بار مسکرا کر ان کی طرف دیکھ لیتا تو وہ یہ سوچ کر دیوانہ وار اپنے پروردگار کا شکر بجالاتے کہ بچے کی طبیعت اب بہتر ہے..... اور بچے کی محض اس ایک مسکراہٹ کی وجہ سے وہ اپنی رات بھر کی تمام تر تھکاوٹ اور پریشانی کو بھول جایا کرتے تھے،

ہر انسان کے بچپن میں یقیناً ایسی کتنی ہی راتیں آتی ہیں.....!!

لہذا قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے انسان کو اپنے والدین کیلئے جو دعاء سکھائی گئی ہے اس میں انسان کیلئے اس کے بچپن کے تذکرہ سے اسے اسی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے والدین کیلئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعاء و فریاد کرتے وقت تصور کی آنکھ سے بچپن کے ان مناظر کو دیکھے، تاکہ اس کے دل میں اپنے والدین کیلئے زیادہ سے زیادہ رقت اور محبت والفت کے جذبات پیدا ہوں اور یوں اس کی یہ دعاء دل کی گہرائیوں سے نکلے اور رب کریم کی بارگاہ میں اسے شرف قبولیت نصیب ہو سکے۔

### ☆ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک:

عورت بھی چونکہ اللہ کی کمزور مخلوق ہے اس لئے اسلام میں اس کے ساتھ بھی حسن سلوک، رحمدلی و ہمدردی اور نرمی برتنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے، خواہ وہ ماں ہو یا بہن، بیوی ہو یا بیٹی، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۱) ترجمہ: (اور تم ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارو)

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: (اَسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا) (۲) ترجمہ: (عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی میری وصیت کو تم یاد رکھنا)

### ☆ بچوں کے ساتھ حسن سلوک:

بچے بھی چونکہ کمزور مخلوق ہیں اس لئے ان کے ساتھ نرمی برتنے اور پیار و محبت سے پیش

(۱) النساء [۱۹]

(۲) مسلم [۱۳۶۸] باب خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة۔ ☆ ابن ماجہ [۱۸۵۱] کتاب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح۔ اس قسم کی حدیث بخاری میں بھی مروی ہے، البتہ اس میں الفاظ یہ ہیں: (اَسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ) ملاحظہ ہو: بخاری [۳۱۵۳] کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: وَاذْ قَال رَّبِّکُمَا لَمَّا کُنْتُمَا فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَتَہُ۔

آنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ بچوں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت و محبت کا سلوک فرماتے تھے، بعض اوقات جب آپ ﷺ نماز میں مشغول ہوتے اور اس دوران کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تو آپ ﷺ اس کی وجہ سے اپنی نماز مختصر فرما دیتے۔

ایک بار آپ ﷺ نے جب اپنے کمسن نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کیا تو وہاں موجود اقرع بن حابس التمیمی نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں، مگر میں نے آج تک ان میں سے کسی کو اس طرح پیار نہیں کیا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: (مَنْ لَا يَرْحَمَ لَا يَرْحَمَ) (۱) ترجمہ: (جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا وہ اللہ کی رحمت کا مستحق بھی نہیں ہو سکتا)

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا) (۲) ترجمہ: (جس نے چھوٹوں پر رحم نہ کیا اور بڑوں کی عزت نہیں کی وہ ہم [مسلمانوں] میں سے نہیں)

☆ کمزور افراد:

معاشرے کے دیگر تمام کمزور افراد مثلاً: عمر رسیدہ افراد، معذور، بیوہ، فقراء، مساکین، یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ رحمدلی و ہمدردی اور حسن سلوک کی خاص تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (۳) ترجمہ: (پس یتیم پر سختی نہ کیا کرو)

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار اپنے ہاتھ کی دونوں بڑی انگلیاں ملا کر فرمایا: (أَنَا وَكَافُلُ

(۱) بخاری [۵۶۵۱] ☆ مسلم [۲۳۱۸] ☆ ابن حبان [۴۵۷] باب الرحمة، نیز: ابن حبان [۴۶۳] [۵۵۹۴]

☆ ترمذی [۱۹۱۱] باب ماجاء فی رحمة الولد ☆ ابوداؤد [۵۲۱۸] ☆ احمد [۲۸۷] [۷۳۶] [۱۰۶۸۴]

(۲) ترمذی [۱۹۱۹] [۱۹۲۰] [۱۹۲۱] باب ماجاء فی رحمة الولد۔ (۳) الضحیٰ: [۹]

الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا) (۱) ترجمہ: (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس قدر قریب ہوں گے جس قدر یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں)  
نیز آپ ﷺ نے فرمایا: (السَّاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمُسْكِينِ كَمَا الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ) (۲) ترجمہ: (بیوہ اور مسکین کی بہتری کیلئے کوشش و جدوجہد کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے)

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: (أَعْطُوا الْأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ) (۳) ترجمہ: (مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو) غرضیکہ قرآن وحدیث میں کمزوروں، محتاجوں اور مسکینوں کی خبر گیری، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کیلئے رحمدلی و مہربانی، انہیں کھانا کھلانا، نیز ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد و اعانت کو ایمان کی علامت اور جنت میں داخلے کا سبب بتایا گیا ہے۔

جبکہ اس کے برعکس ان کے ساتھ ترش روئی اور بدسلوکی روا رکھنا، ان کی خدمت و احترام کے معاملہ میں بے توجہی اور غفلت و بے اعتنائی برتنا، نیز ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی بدسلوکی ظلم و زیادتی اور ان کی حق تلفی کو کفر و نفاق کی نشانی اور جہنم میں داخلے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔  
- سورة الماعون کا بھی یہی مفہوم ہے۔

(۱) بخاری [۴۹۹۸] باب ماجاء فی اللعان وقول اللہ تعالیٰ؛ والذین یرمون أزواجہم.....

نیز: بخاری [۵۶۵۹] باب حسن العہد من الایمان۔ ☆ ترمذی [۱۹۱۸] باب ماجاء فی رحمۃ الیتیم وکفالتہ

☆ ابوداؤد [۵۱۵۰] باب فی من ضم الیتیم۔

(۲) بخاری [۵۰۳۸] کتاب الفقہات، باب فضل الفقۃ علی الأہل.....

نیز: بخاری [۵۶۶۰] باب الساعی علی الارملۃ۔ ☆ مسلم [۲۹۸۲] ☆ ابن حبان [۴۲۴۵] ☆ ابن ماجہ [۲۱۴۰]

☆ ترمذی [۱۹۶۹] باب ماجاء فی الساعی علی الارملۃ والیتیم ☆ نسائی [۲۵۷۷] باب فضل الساعی علی الارملۃ۔

(۳) ابن ماجہ [۲۴۴۳] باب أجر الأجراء۔

### ☆ حیوانات کے ساتھ رحمدلی و مہربانی:

اسلام دینِ رحمت ہے، اور اس کی رحمتوں کا فیضان صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اسلام میں حیوانات تک کے ساتھ حسن سلوک اور رحمت و مہربانی کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي فَاسْتَدَّ عَلَيْهِ الْعَطَشُ فَنَزَلَ بِئْرًا فَشَرِبَ مِنْهَا، ثُمَّ خَرَجَ فَإِذَا هُوَ بِكَلْبٍ يَلْهَثُ يَأْكُلُ التُّرَى مِنَ الْعَطَشِ، فَقَالَ: لَقَدْ بَلَغَ هَذَا مِثْلَ الَّذِي بَلَغَ بِي، فَمَلَأَ خُفَّهُ ثُمَّ أَمْسَكَهُ بِفِيهِ، ثُمَّ رَقَى فَسَقَى الْكَلْبَ، فَشَكَرَ اللَّهُ لَهُ فَغَفَرَهُ) (۱) ترجمہ: (ایک بار ایک شخص راستے میں چلا جا رہا تھا کہ اسے پیاس نے ستایا، وہ پانی پینے کی غرض سے کنویں پر گیا، پانی پینے کے بعد وہاں اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت کی وجہ سے ہانپ رہا ہے اور کنویں کے قریب گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ شخص سوچنے لگا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے پیاس کی شدت کی وجہ سے میرا جو حال تھا اس بیچارے کتے کا بھی وہی حال ہے۔ اور پھر اس نے اپنے موزے میں پانی بھرا اور اسے منہ میں دبائے ہوئے اوپر چڑھتا ہوا کنوئیں سے باہر آیا اور اس کتے کو وہ پانی پلایا، اس پر اللہ کی طرف سے اس کے اس عمل کی قدر دانی کے طور پر اس کیلئے مغفرت کا فیصلہ کر لیا گیا)

جبکہ اس کے برعکس ایک بار آپ ﷺ نے ایک عورت کے بارے میں فرمایا کہ: (عُذِّبَتْ اِمْرَاَةٌ فِي هَرَّةٍ حَبَسَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ جُوعًا) (۲)

ترجمہ: (ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے [جہنم کے] عذاب میں ڈال دیا گیا ہے، کیونکہ

(۱) بخاری [۳۶۶۳] باب رحمۃ الناس والبیہائم ☆ مسلم [۲۲۴۳] باب فضل ساقی البہائم.....

☆ ابن حبان [۵۴۴] ☆ موطا مالک [۱۶۶۱] ☆ احمد [۸۸۶۱] [۱۰۷۱۰] [۱۰۷۲۲] ☆ ابوداؤد [۲۵۵۰]

(۲) بخاری [۲۲۳۶] باب فضل سقی الماء۔ نیز: بخاری [۳۱۲۰] نیز: [۳۲۹۵] باب قول اللہ تعالیٰ:

اس نے اس بلی کو قید کر دیا تھا، اور پھر اسی قید کی حالت میں ہی بھوک کی وجہ سے وہ مر گئی) ☆..... قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی گئی گذشتہ تمام تفصیل سے اصل مقصود یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس بارے میں مکمل خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ جس اللہ پر ہمارے دلوں میں ایمان ہے وہ اللہ رحمن اور مہربان ہے، جس قرآن پر ایمان ہے وہ بھی رحمت ہے، اسی طرح نبی ﷺ بھی رحمت ہیں، جس جنت کی طلب اور آرزو ہے وہ بھی رحمت ہے، مگر اس کے باوجود ہمارے دل آپس میں ایک دوسرے کیلئے اگر رحمدلی و ہمدردی کے جذبات سے خالی و محروم ہوں تو یقیناً یہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کی صریح خلاف ورزی ہوگی، اور یہ تو بڑی محرومی و بدبختی کی بات ہوگی، بلکہ یہ تو یقیناً جرم عظیم ہوگا۔



باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

وہش فیما من کل داتیہ۔ ☆ مسلم [۹۰۴] نیز: مسلم [۲۲۴۲] [۲۲۴۳] باب تحریم قتل الہرۃ۔ نیز: مسلم [۲۶۹۱]  
☆ ابن حبان [۵۴۶] نیز [۵۶۲۱] [۵۶۲۲] ذکر وصف عذاب ہذہ المرأة التي ربطت الہرۃ حتی ماتت۔  
☆ ابن ماجہ [۱۲۹۵] باب ماجاء فی صلاۃ الخوف۔  
☆ نسائی [۱۴۸۲] نیز [۱۴۹۶] باب القول فی السجۃ فی صلاۃ الکسوف۔  
☆ احمد [۶۸۳] [۶۷۳] [۷۵۳۸] [۷۶۳۵] [۸۱۸۶] [۹۸۹۲] [۱۰۰۳۵] [۱۰۲۱۱] [۱۰۵۰۸]  
[۱۰۵۹۲] [۱۴۳۵] [۱۴۶۴۲] [۱۵۰۶۰] [۲۷۰۰۸] [۲۷۰۰۹]  
البتۃ لبعض روایات میں اس حدیث کی ابتداء اس طرح ہے: (دَخَلَتْ اِمْرَاۃ النَّارِ فِیْ هِرَّةٍ.....)

## ”حسد: بدترین خصلت“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے صدیوں سے گمراہی و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتی اور سسکتی انسانیت کی صلاح و فلاح کی خاطر اپنے پیارے اور محبوب ترین بندے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بشیر و نذیر اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔

رسول اللہ ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں سے ایک مقصد ”تزکیہ نفوس“ (یا ”اصلاح باطن“) بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۱) ترجمہ: (یقیناً اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہی میں سے، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی، اور پاک کرتا ہے ان کو، اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت، حالانکہ وہ تو اس سے قبل صریح گمراہی میں مبتلا تھے)

اس آیت میں ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ یعنی: ”اور پاک کرتا ہے ان کو“ کی تفسیر میں ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (أَي يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ لِيَتَزَكَّوْا نَفُسُهُمْ وَتَطْهَرَمِنَ الدَّنَسِ وَالْخُبْثِ) (۲) یعنی: ”رسول اللہ ﷺ ایمان والوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، تاکہ ان کے دل ہر قسم کی برائی سے پاک و صاف ہو جائیں۔“

غرضیکہ ہر مسلمان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری و لازمی ہے کہ وہ ظاہری نظافت و طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی و روحانی نظافت و طہارت کا بھی اہتمام و التزام کرے، اور اس کا دل و دماغ، اس کا ذہن، اور اس کی سوچ کفر و شرک، معصیت و ضلالت، حسد، کینہ، بغض و عداوت وغیرہ ہر قسم کی نجاست و ناپاکی سے پاک و صاف ہو۔

### ☆ حسد کی تعریف:

عربی لغت میں ”حسد“ کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں: (تَمَنِّي أَنْ تَتَحَوَّلَ إِلَيْهِ نِعْمَتُهُ أَوْ أَنْ يُسَلِّبَهَا) (۱) یعنی: ”کسی کے پاس موجود کوئی نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ یہ نعمت کاش کسی طرح اس کی بجائے مجھے مل جائے، ورنہ یہ کہ یہ نعمت اُس شخص سے بھی چھین جائے۔“ یعنی کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ کر یہ حسرت و آرزو کرنا کہ کاش یہ چیز کسی طرح اس شخص کی بجائے مجھے مل جائے، اور اگر ایسا ممکن نہیں تو کم از کم یہ کہ یہ چیز اس شخص کے پاس بھی نہ رہے، جس طرح میں اس نعمت سے محروم ہوں اسی طرح یہ شخص بھی اس سے محروم ہو جائے۔

علمائے ”حسد“ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے: (تَمَنِّي زَوَالِ مَا أَنْعَمَ اللَّهُ بِهِ عَلَى عَبْدٍ مِنْ نِعْمَةٍ دِينٍ أَوْ دُنْيَا) یعنی: ”کسی کے پاس اللہ کی عطا کردہ کوئی دینی یا دنیاوی نعمت کے بارے میں اس بات کی حسرت و آرزو کرنا کہ یہ شخص کسی طرح اس نعمت سے محروم ہو جائے۔“

اسی مکروہ و مذموم ترین جذبہ و خواہش کا نام ”حسد“ ہے۔

(۱) المعجم الوسيط، صفحہ: ۱۷۲۔ جلد: ۱۰۔ بعض کتب لغت میں حسد کی تعریف مختصر اُس طرح کی گئی ہے: (تَمَنِّي زَوَالِ النِّعْمَةِ مِنَ الْمَحْسُودِ) یعنی: محسود کے بارے میں یہ آرزو رکھنا کہ اس کے پاس موجود نعمت کا خاتمہ ہو جائے۔



البتہ یہ خواہش کہ ”فلاں شخص کے پاس جو نعمت ہے وہ اس کے پاس موجود و برقرار رہے اور اسی جیسی نعمت اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے بھی عنایت فرمادیں“ یہ چیز ”حسد“ میں شامل نہیں۔

### ☆ حسد کی مذمت میں چند احادیث:

اس بارے میں مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں، تاکہ حسد کی قباحت مزید واضح ہو سکے:

☆ (إِيَّاكُمْ وَ الْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ) (۱) ترجمہ: (حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو کھا جاتی ہے)

☆ (لَا تَبَاغُضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا) (۲) ترجمہ: (ایک دوسرے کیلئے دل میں بغض و کینہ نہ رکھو؛ باہم حسد نہ کرو؛ آپس میں بے تعلق نہ رہو؛ اور اللہ کے بند و آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ)

☆ (لَا يَجْتَمِعُ فِي جَوْفِ عَبْدٍ الْإِيمَانُ وَالْحَسَدُ) (۳) ترجمہ: (کسی بندے کے دل میں ایمان اور حسد دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں)

یعنی اگر دل میں ایمان ہوگا تو وہاں حسد کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اور اگر دل میں حسد پیدا

(۱) ابوداؤد [۴۹۰۳] باب فی الحسد - ☆ ابن ماجہ [۴۲۱۰]

(۲) بخاری [۵۷۲۶] باب ما سُئِيَ عَنْ التَّحَاسُدِ وَالتَّدَابُرِ وَقَوْلُهُ تَعَالَى: وَمَنْ شَرَّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ۔

☆ مسلم [۲۵۵۹] باب تحريم التماسد والتباغض - ☆ ابن حبان [۵۶۶۰] ☆ موطا مالک [۲۶۱۵]

☆ ابن ماجہ [۳۸۴۹] باب الدعاء بالعفو والعافية - ☆ ترمذی [۱۹۳۵] باب ما جاء في الغيبة - ☆ احمد [۵] [۱۷]

(۳) ابن حبان [۴۶۰۶] ذکر نفی اجتماع الغبار فی سبیل اللہ وفتح جہنم فی جوف مسلم۔

ہو گیا تو پھر وہاں ایمان باقی نہیں رہے گا۔

☆ (لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا لَمْ يَتَحَاسَدُوا) (۱) ترجمہ: (لوگ سلامت رہیں گے تا وقتیکہ ایک دوسرے سے حسد نہ کریں) یعنی اگر ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہماری زندگی سلامتی اور خیر و عافیت کے ساتھ بسر ہو، تو رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق ہمیں حسد سے مکمل گریز کرنا چاہئے، کیونکہ یہ حسد ایسی مکروہ و مذموم خصلت ہے کہ جس کی وجہ سے انسان بہت سی مصائب و مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے، بلکہ تمام معاشرہ ہی افراتفری و انتشار اور پھر بالآخر انحطاط و زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

☆ حسد سے پاک انسان کیلئے جنت کی خوشخبری:

☆ عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: كُنَّا جُلُوسًا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَطْلُعُ الْآنَ عَلَيْكُمْ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَطَلَعَ رَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ تَنْطَفُ لِحَيَّتِهِ مِّنْ وَضُوئِهِ، قَدْ عَلَّقَ نَعْلَيْهِ بِيَدِهِ الشِّمَالِ، فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مِثْلَ ذَلِكَ، فَطَلَعَ ذَلِكَ الرَّجُلُ مِثْلَ الْمَرَّةِ الْأُولَى، فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمَ الثَّالِثُ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مِثْلَ مَقَالَتِهِ أَيْضًا، فَطَلَعَ ذَلِكَ الرَّجُلُ عَلَى مِثْلِ حَالِهِ الْأَوَّلِ، فَلَمَّا قَامَ النَّبِيُّ ﷺ تَبِعَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرِو، فَقَالَ إِنِّي لَأَحْيَتُ أَبِي فَاقْسَمْتُ أَنِّي لَا أَدْخُلُ عَلَيْهِ ثَلَاثًا، فَإِنْ رَأَيْتَ أَنْ تُؤْوِيَنِي حَتَّى تَمْضِيَ، فَعَلْتُ، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ أَنَسُ: فَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُحَدِّثُ أَنَّهُ بَاتَ مَعَهُ تِلْكَ الثَّلَاثَ اللَّيَالِي، فَلَمْ يَرَهُ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّهُ إِذَا تَعَارَّ

(۱) مجمع الزوائد (عن ضمرة بن ثعلبة) جلد: ۸، صفحہ: ۷۸۔ نقل عن الطبرانی۔

نیز: الترغیب والترہیب [۸/۴۳۷] بحوالہ طبرانی۔

تَقَلَّبَ عَلَى فِرَاشِهِ ذَكَرَ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ، وَكَبَّرَ حَتَّى لِبَصَافَةِ الْفَجْرِ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ: غَيْرَ أَنِّي لَمْ أَسْمَعُهُ يَقُولُ إِلَّا خَيْرًا، فَلَمَّا مَضَتِ الثَّلَاثُ اللَّيَالِي وَكَدْتُ أَنْ أَحْتَقِرَ عَمَلَهُ قُلْتُ: يَا عَبْدَ اللَّهِ! لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَ أَبِي غَضَبٌ وَلَا هُجْرَةٌ، وَلَكِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ: يَطْلُعُ الْآنَ عَلَيْكُمْ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَطَلَعْتَ أَنْتَ الثَّلَاثَ الْمَرَّاتِ، فَأَرَدْتُ أَنْ آوِيَ إِلَيْكَ فَأَنْظُرَ مَا عَمَلُكَ فَأَقْتَدِيَ بِكَ، فَلَمْ أَرَكَ عَمِلْتَ كَبِيرَ عَمَلٍ، فَمَا الَّذِي بَلَغَ بِكَ مَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ؟ قَالَ: مَا هُوَ إِلَّا مَا رَأَيْتَ، فَلَمَّا وَلَّيْتُ دَعَانِي فَقَالَ: مَا هُوَ إِلَّا مَا رَأَيْتَ، غَيْرَ أَنِّي لَا أَجِدُ فِي نَفْسِي لِأَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ غِشًّا، وَلَا أَحْسُدُ أَحَدًا عَلَى خَيْرٍ أَعْطَاهُ اللَّهُ إِيَّاهُ، فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ: هَذِهِ الَّتِي بَلَغْتَ بِكَ (۱)

ترجمہ: (حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک روز جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ”ابھی تمہارے سامنے ایک شخص آنے والا ہے جو کہ اہل جنت میں سے ہے۔ چنانچہ انصار میں سے ایک صاحب اندر داخل ہوئے، جن کی داڑھی سے تازہ وضوء کی وجہ سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، اور انہوں نے بائیں ہاتھ میں اپنے جوتا تھاما ہوا تھا۔ دوسرے روز بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا، یعنی رسول اللہ ﷺ نے وہی الفاظ دہرائے، اور تب بھی وہی صاحب اسی حالت میں دکھائی دیئے۔ تیسرے روز پھر یہی واقعہ پیش آیا اور پھر وہی صاحب اسی کیفیت میں نمودار ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ مجلس سے اٹھ گئے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما [انصاری شخص] [

کے تعاقب میں روانہ ہوئے [تاکہ ان کے جنتی ہونے کا سبب معلوم کر سکیں] اور ان سے کہا کہ میری اپنے والد سے کچھ رنجش ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے میں نے یہ قسم کھالی ہے کہ میں تین روز تک گھر نہیں جاؤں گا، لہذا اگر آپ مناسب سمجھیں تو تین روز تک مجھے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دیدیں۔ انہوں نے اس بات کو منظور کر لیا۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ تین راتیں ان کی معیت میں گزاریں، اور ان کی کیفیت یہ دیکھی کہ وہ رات کے وقت تہجد کیلئے نہیں اٹھتے، البتہ نیند کے دوران جب بھی ذرہ سی ان کی آنکھ کھلتی اور وہ کروٹ بدلتے تو اللہ کا ذکر اور تسبیح وغیرہ پڑھتے، فجر تک یہی کیفیت رہتی۔ البتہ اس پورے عرصہ میں میں نے ان کی زبان سے کلمہ خیر کے سوا اور کچھ نہیں سنا [یعنی انہوں نے ہمیشہ صرف اچھی بات ہی کہی]۔ جب اسی کیفیت میں تین راتیں گزر گئیں اور قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے عمل کی حقارت آجائے (۱) تب میں نے ان پر اپنا راز ظاہر کر دیا کہ میری اپنے والد کے ساتھ کوئی رنجش وغیرہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین روز مسلسل یہ بات سنی کہ: ”ابھی تمہارے سامنے ایسا شخص آنے والا ہے کہ جو اہل جنت میں سے ہے۔“ اور تینوں دن مسلسل آپ ہی نمودار ہوئے، اس لئے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ کے ساتھ رہوں، تاکہ آپ کے معمولات کا مشاہدہ کر سکوں اور پھر میں خود بھی انہی معمولات کو اپنائوں۔ مگر [تعجب ہے کہ] میں نے آپ کو کوئی خاص بڑا عمل انجام دیتے ہوئے تو دیکھا نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں یہ بات ارشاد فرمائی؟۔ وہ کہنے لگے کہ: ”میرے پاس تو بس یہی کچھ ہے جو تم دیکھ چکے ہو۔“ یہ سن کر جب میں واپس روانہ ہونے لگا تو انہوں نے مجھے آواز دی اور کہنے لگے کہ:

(۱) یعنی قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے بارے میں یہ خیال پیدا ہونے لگے کہ یہ صاحب کوئی بہت زیادہ مجاہدہ یا کوئی خاص عبادت تو انجام دیتے نہیں، پھر کس طرح اہل جنت میں سے ہو گئے.....؟

”ہاں! ایک بات یہ ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کدورت اور بغض و کینہ نہیں رکھتا، نیز یہ کہ اللہ نے جس کسی کو کوئی اچھی چیز عطاء کی ہو تو میں کبھی اس سے حسد نہیں کرتا“۔ یہ بات سن کر عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ: ”یہی تو وہ صفت ہے جس کی وجہ سے آپ کو یہ بلند ترین مقام نصیب ہوا ہے“۔

### ☆ حسد کی تباہ کاریاں:

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حسد انتہائی خطرناک، بدترین اور مہلک ترین جذبہ ہے اور اس کے اثرات بدیقیناً لامحدود ہیں۔

چنانچہ اگر غور و فکر کیا جائے تو یہی حقیقت آشکارا ہو کر رہیگی کہ انسانی معاشرے میں اکثر و بیشتر جرائم کا اصل محرک یہی جذبہ سیاه ہی ہے۔ حسد کی وجہ سے بھائی بھائی آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں، باہمی الفت و محبت کی جگہ نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں، دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے، تاریخ عالم گواہ ہے کہ حسد کی وجہ سے بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتیں برباد ہو گئیں، پُر رونق بستیاں کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں، جس معاشرے کے افراد میں حسد جیسی مکروہ و مذموم خصلت پائی جاتی ہو وہ معاشرہ انحطاط و زوال کا شکار ہو جاتا ہے، اس کی دیواروں میں شکاف پڑ جاتے ہیں، بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، رفتہ رفتہ اس معاشرے اور ملک و ملت کی تمام عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے اور اس طرح اجتماعی موت واقع ہو جاتی ہے۔

☆ ..... امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ سورۃ الفلق کی تفسیر میں فرماتے ہیں: (الحسد اَوَّلُ

ذَنْبٍ عَصَى اللّٰهَ بِهِ فِي السَّمَاءِ، وَأَوَّلُ ذَنْبٍ عَصَى اللّٰهَ بِهِ فِي الْأَرْضِ، فَحَسَدُ ابْلِيسَ آدَمَ، وَحَسَدُ قَابِيلَ هَابِيلَ) یعنی: ”حسد وہ اولین گناہ ہے جس

کے ذریعے آسمان میں اللہ کی نافرمانی کی گئی، اور حسد ہی وہ اولین گناہ ہے جس کے ذریعے زمین میں اللہ کی نافرمانی کی گئی، [آسمان میں] ابلیس نے آدم [علیہ السلام] سے حسد کیا، اور [زمین میں] قابیل نے ہابیل سے حسد کیا“۔ (۱)

ابلیس نے سب سے پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا، انہیں جنت سے نکلوایا، اور پھر خود بھی مردود و ملعون ہو کر جنت سے نکلا، اور وہاں سے نکلتے وقت اس نے یہ عہد کیا کہ اولادِ آدم سے انتقام لینے کیلئے وہ قیامت تک ہر انسان کو صراطِ مستقیم سے منحرف و برگشتہ کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتا رہیگا، تاکہ جس طرح وہ خود جنت سے محروم ہوا ہے اسی طرح اولادِ آدم کی بھی زیادہ سے زیادہ تعداد کو جنت سے محروم کر کے جہنم کا ایندھن بنا دیا جائے۔

لہذا جب بھی کوئی انسان اپنے خالق و مالک کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنی آخرت برباد کرتا ہے تو وہ درحقیقت ابلیس کے اسی جوشِ انتقام کا نشانہ بننے کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، اور اس تمام تر مصیبت کا اصل اور بنیادی سبب یہی ہے کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام سے حسد کیا۔

☆..... اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے سب سے پہلا انسانی خون بہایا اور اس روئے زمین پر فتنہ و فساد، قتل و غارتگری اور انسانی خون بہانے کی فتنج ترین رسم ڈالی، چنانچہ آج تک اس دنیا میں فتنہ و فساد، قتل و غارتگری اور خونریزی کا سلسلہ جاری ہے، اس تمام تر مصیبت و بربادی کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ قابیل نے ہابیل سے حسد کیا۔

(۱) الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) میں سورۃ الفلق کی آیت ”ومن شر حاسد اذا حسد“ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

☆..... اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ستایا، تکلیفیں پہنچائیں، مارا پیٹا، قتل کرنے کی سازش اور کوشش کی، ویران اور تاریک کنوئیں میں پھینک دیا، جہاں سانپ، بچھو، دوسرے زہریلے حشرات الارض کی بہتات تھی، اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بازار میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے، اور پھر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے نختِ جگر کی جدائی اور گرم شدگی کے غم میں ساہا سال تک روتے رہے، یہاں تک کہ کثرتِ گریہ کی وجہ سے آنکھوں کی مینائی بھی جاتی رہی، اس تمام تر مصیبت و پریشانی کا اصل سبب بھی یہی تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے بھائیوں نے حسد کیا۔

☆..... اسی طرح اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ (۱) ترجمہ: (وہ) لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطاء کی ہے وہ انہیں [یعنی حضرت محمد ﷺ کو] پہچانتے ہیں، جیسا کہ وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو)

یعنی یہ یہود و نصاریٰ جس طرح اپنے بیٹوں کو خوب اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں، یا کوئی بھی انسان جس طرح اپنی اولاد کو بغیر کسی شک و شبہ اور بغیر کسی دقت یا تردد کے خوب اچھی طرح اور یقینی طور پر جانتا اور پہچانتا ہے، بالکل اسی طرح یہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کو اور آپؐ پر نازل شدہ کتاب، نیز آپؐ کے لائے ہوئے دین اسلام کی حقانیت اور صداقت کو خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اسلام قبول نہیں کرتے، اور نہ صرف یہ کہ خود اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ مزید یہ کہ دوسروں کو بھی

راہِ حق سے گمراہ و برگشتہ کرنے کے درپے رہتے ہیں، اور مسلمانوں کے بارے میں ہمیشہ سے ان کی یہی خواہش و کوشش رہی ہے کہ کسی طرح انہیں بھی صراطِ مستقیم سے برگشتہ کر دیا جائے اور دینِ برحق یعنی اسلام کی نعمت سے انہیں محروم کر دیا جائے..... جیسا کہ قرآن کریم میں ان کی اس مذموم خواہش کا تذکرہ ہے:

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (۱) ترجمہ: (اہل کتاب میں سے اکثر و بیشتر لوگ اس بات کی خواہش کرتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹا دیں، حسد کی وجہ سے جو ان کے دلوں میں ہے، بعد اس کے کہ ان پر حق خوب واضح ہو چکا)

نیز قرآن کریم میں ان اہل کتاب کے اسی حسد کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۲) ترجمہ: (کیا یہ اہل کتاب حسد کرتے ہیں لوگوں [مسلمانوں] سے اس بات پر کہ اللہ نے ان پر اپنا فضل فرمایا)

غرضیکہ یہ یہود و نصاریٰ دینِ اسلام کی حقانیت و صداقت سے بخوبی اور قطعی واقفیت کے باوجود اسے قبول کرنے کی بجائے روزِ اول سے ہی اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے پر کمر بستہ ہیں، ابتدائے اسلام ہی سے انہوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع کر دیا، کبھی رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی، کبھی آپ ﷺ پر جادو کیا، کبھی آپ ﷺ کے کھانے میں زہر ملایا، اس طرح یہ لوگ ہمیشہ ہی



رسول اللہ ﷺ کیلئے جسمانی و روحانی، نیز ظاہری و باطنی قسم کی اذیتوں اور پریشانیوں کا سبب بنتے رہے۔

اور پھر عہد رسالت کے بعد بھی یہ اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں ہی مصروف رہے، صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کا قتل عام کیا، اسپین میں نہایت سفاکی و بیدردی کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، اور یہی صورت حال آج کے اس مہذب و ترقی یافتہ دور میں بھی دنیا کے مختلف خطوں میں دیکھی جاسکتی ہے.....!!

اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اس تمام تر مصیبت و آفت کا اصل اور حقیقی سبب بھی (قرآن کے فیصلے مطابق) یہی ہے کہ یہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں۔

حسد کی تباہ کاریوں کے بارے میں یہ محض چند مثالیں درج کی گئی ہیں جن سے اس بات کا صحیح اندازہ ہو جانا چاہئے کہ یہ جذبہ سیاہ انسانیت کیلئے کس قدر خطرناک اور تباہ کن ہے۔

### حاسد کیلئے دینی و دنیاوی خسارہ:

#### ☆ شیطان سے مماثلت:

حاسد انسان کو اپنی بدبختی کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہئے کہ قرآن کریم میں موعود تین یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں جس طرح شیطان اور اس کے چیلوں کے شر سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، بعینہ اسی طرح حاسد کے شر سے بھی اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، گویا کہ حاسد کا شر انسانیت کیلئے شیطان کے شر سے کم خطرناک نہیں ہے، بالفاظ دیگر حاسد شخص بھی انسانیت کیلئے اسی قدر خطرناک ہے کہ جس

قدر شیطان خطرناک ہے۔

### ☆ تمام نیکیوں کا ضیاع:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الْحَسَدُ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)

(۱) ترجمہ: (حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو کھا جاتی ہے)

لہذا حاسد انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ پر رحم کرے اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی نیکیاں ضائع اور برباد کرنے سے باز رہے۔

### ☆ غیبت اور چغلی کا سبب:

حاسد انسان جس کسی سے حسد کرتا ہے جگہ جگہ اس کی غیبت اور چغلی کرتا پھرتا ہے اور اس کے عیوب بیان کرتا ہے، حالانکہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۲) ترجمہ: (ہر طعنہ دینے والے عیب چنے والے کیلئے بربادی ہے)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَامٌ) (۳)

ترجمہ: (چغل خور انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔

نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: (مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى قَبْرَيْنِ فَقَالَ: إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَمْشِي بِالنِّمِيْمَةِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ) (۴) وفي رواية:

(وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُهُ مِنْ بَوْلِهِ) (۴)

(۲) المزمرة [۱]

(۱) ابوداؤد، باب فی الحسد [۴۹۳۰] ابن ماجہ [۴۲۱۰]

(۳) مسلم [۱۰۵] باب بیان غلط تحریم النمیمۃ - نیز: احمد [۲۳۳۷۳] (۴) حاشیہ آئندہ صفحہ پر.....

ترجمہ: (رسول اللہ ﷺ ایک بار دو قبروں کے قریب سے جب گزرے تو آپؐ نے فرمایا: (اس وقت یہ دونوں قبروں والے عذاب میں مبتلا ہیں، حالانکہ جس وجہ سے عذاب میں مبتلا ہیں وہ [بظاہر] کوئی خاص بہت بڑی وجہ نہیں ہے (۱) ان میں سے ایک شخص [اس لئے عذاب میں مبتلا ہے کہ] چغلیاں کیا کرتا تھا، جبکہ دوسرا شخص پیشاب سے بچنے کا اہتمام نہیں کیا کرتا تھا)۔

### ☆ ایذا رسانی:

حاسد انسان ہمیشہ مختلف حیلوں، تدبیروں اور سازشوں کے ذریعے اپنے محسود کو اذیت و تکلیف اور گزند و نقصان پہنچانے کی جدوجہد و کوشش میں مشغول رہتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ) (۲) ترجمہ: (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں)

### ☆ نفرت پھیلاتا:

حاسد انسان ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے دوسروں کی عیب جوئی کر کے معاشرے میں نفرت، نفاق اور انتشار پھیلاتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتَّى تَتُؤْمِنُوا، وَلَا تَتُؤْمِنُوا حَتَّى تُحَابُّوْا، أَوْ لَا أَدْلُكُمْ عَلَىٰ

بقیہ: حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۴) بخاری [۱۳۱۲] باب ماجاء فی عذاب القبر من الغیۃ والبول۔ مسلم [۲۹۲] باب نجاسة الدم وکيفية غسلہ۔

(۱) یعنی وہ کوئی ایسی بہت بڑی مشکل بات نہیں تھی کہ جس سے بچنا ان دونوں کیلئے بہت مشکل کام تھا، بلکہ وہ تو بہت ہی معمولی اور آسان سی بات تھی کہ اگر یہ اس سے بچنا چاہتے تو سہولت بچ سکتے تھے، مگر انہوں نے اس سے بچنے کی فکر اور کوشش ہی نہیں کی، جس کے نتیجے میں اب یہ دونوں اپنی اپنی قبر میں بڑے عذاب میں مبتلا ہیں۔

(۲) بخاری [۱۰] باب: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ ☆ مسلم [۴۱] [۴۲]

أَمْرٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ (۱) ترجمہ: (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ تم مؤمن نہ بن جاؤ، اور تم مؤمن نہیں بن سکتے تاوقتیکہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا برتاؤ نہ کرنے لگو، کیا میں تمہیں نہ بتا دوں ایک ایسی چیز کہ اگر تم اسے اپنا لؤ تو باہم محبت کرنے لگو گے؟ آپس میں ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سلام کیا کرو)۔

### ☆ اپنے ہی مفادات کی بربادی:

حاسد انسان معاشرے میں نفرت کے بیج بوتا ہے، جس کی وجہ سے پورے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں، اور پھر رفتہ رفتہ تمام معاشرہ اور ملک زوال و انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے، لہذا حاسد انسان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ خود بھی تو اسی معاشرے کا ہی فرد اور حصہ ہے کہ جس کی تباہی کا وہ خود سبب بن رہا ہے، اور جب وہ معاشرہ اور ملک و ملت ہی سلامت نہ رہے تو پھر اس کے بعد اس حاسد کو کہاں ٹھکانہ نصیب ہوگا؟ لہذا حاسد انسان درحقیقت خود اپنے ہی مفادات کا دشمن ہے اور اپنا ہی آشیانہ نذرِ آتش کر دینے کے درپے ہے۔

### ☆ صحت کی بربادی:

حاسد انسان دوسروں کی نعمتیں دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ کسی طرح وہ ان نعمتوں سے محروم ہو جائیں۔ چونکہ یہ حاسد دوسروں کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا، لہذا خود ہی حسد کی اس آتش سوزاں میں ہمیشہ جلتا رہتا ہے، ہر وقت اداس اور پریشان رہتا ہے، جس کے لازمی نتیجے کے طور پر وہ متعدد جسمانی و نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے، محاورہ مشہور ہے: (النَّارُ تَأْكُلُ

(۱) مسلم [۵۴] باب بیان أنہ لا یدخل الجنة الا المؤمنون..... ☆ ابن حبان [۲۳۶] ابن ماجہ [۶۸] [۳۶۹۲]

☆ ترمذی [۲۶۸۸] باب ماجاء فی افشاء السلام ☆ احمد [۱۴۱۲]

نَفْسَهَا إِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَأْكُلُ) یعنی: ”آگ کو جب کوئی چیز جلانے کیلئے نہیں ملتی تو وہ خود اپنے آپ کو ہی جلا کر ختم کر دیتی ہے۔“

بعینہ اسی طرح حاسدانسان دوسروں کی نعمتوں اور ان کی مسرتوں کو دیکھ کر ”خودسوزی“ کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے، اپنا سکون اور اپنی صحت برباد کرتا ہے، اور یوں وہ خود اپنے آپ پر، نیز اپنے ان بچوں پر بھی ظلم کرتا ہے کہ جنہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔

### ☆ اللہ کی تقسیم پر اعتراض:

اس دنیا میں جس کسی انسان کو جو کوئی بھی نعمت میسر ہے درحقیقت اسے وہ اللہ کی طرف سے ملی ہے، کسی کو کسی نعمت سے نوازنے میں، اور کسی کو محروم رکھنے میں کیا حکمت و مصلحت پوشیدہ ہے؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ البتہ مسلمان کیلئے اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ کی ہر تقسیم اور اس کے ہر فیصلے کو دل و جان سے درست تسلیم کرے اور اس پر راضی و مطمئن رہے، بلکہ یہ چیز تو خود اللہ پر ایمان ہی کے مفہوم میں شامل ہے۔ (۱)

جبکہ اس کے برعکس حاسدانسان دوسروں کے پاس موجود اللہ کی نعمتوں کا مشاہدہ کر کے اور ان کی خوشحالی و آسودگی کو دیکھ کر غمگین اور ناراض ہوتا ہے، گویا کہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اس تقسیم پر خوش نہیں ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ کیسا مسلمان ہے کہ جسے ”اللہ کی تقسیم“ پر اعتراض ہے.....؟

☆..... خصوصاً جبکہ یہ بھی ایک اٹل اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس عارضی و فانی دنیا

(۱) ”اللہ پر ایمان“ کے ضمن میں ہی اللہ کی بنائی ہوئی ”تقدیر“ پر ایمان بھی شامل ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کتاب: ”اسلامی عقائد“ از: مؤلف۔

میں جس کسی انسان کے پاس جو کچھ بھی خوشحالی و فراوانی اور مسرت و شادمانی کا سامان موجود ہے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ واقعی اللہ کی طرف سے اس کیلئے بطور انعام و احسان ہی ہو.....! کیونکہ یہ دنیاوی نعمتیں اور آسائشیں تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ مؤمن و کافر، صالح و فاسق سب ہی کو عطا فرماتا ہے، کسی کو بطور انعام، کسی کو بطور امتحان، جبکہ کسی کو یہی نعمتیں بطور وبال جان بھی دی جاتی ہیں، یعنی یہی نعمتیں اس کیلئے سکون و اطمینان کے فقدان اور راحت و آرام کی تباہی و بربادی کا سامان بن جایا کرتی ہیں، بالفاظِ دیگر یہی نعمتیں اس کیلئے عذاب ثابت ہوتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ بظاہر آسودہ و خوشحال نظر آنے والے اس انسان کی زندگی اور اس کے شب و روز خود اس انسان سے بھی بدتر ہوں کہ جو اس کی اس خوشحالی و آسودگی کی وجہ سے حسد میں مبتلا ہے اور اپنا دین و ایمان، اپنی دنیا و آخرت نیز اپنی صحت و تندرستی برباد کرنے پر آمادہ و کمر بستہ ہے.....!!

لہذا کسی کے پاس محض ظاہری نعمتیں اور آسائشیں دیکھ کر ”حسد“ جیسی بدترین خصلت، مہلک ترین عادت، بلکہ فتنہ ترین آفت میں مبتلا ہو کر خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی دنیا و آخرت، اپنی صحت و تندرستی برباد کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خالق و مالک اور محسن و منعم کو ناراض کرنا اور اس کے غیظ و غضب کو دعوت دینا کہاں کی دانشمندی ہے.....؟

☆..... مزید یہ کہ یہ بات بھی تو عین ممکن ہے کہ اس محسود (یعنی جس سے حسد کیا جا رہا ہے) کی یہ دنیاوی کامیابی، جاہ و منصب اور خوشحالی و آسودگی، نیز اس کے پاس موجود دیگر تمام نعمتیں حرام و ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ ہوں، ایسے میں بظاہر نعمت نظر آنے والی یہ تمام چیزیں تو آخر کار یقیناً اس کیلئے عذاب اور وبالِ جان ہی ثابت ہوں گی، اور قبر میں یہ تمام چیزیں سانپ اور بچھو بن کر اسے ڈسینگیں.....!!

لہذا ان ”سانپوں“ اور ”پچھوؤں“ سے دوری و سلامتی اور عافیت و نجات پر تو خلوص دل کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے..... نہ یہ کہ اس عافیت و سلامتی پر رنج و ملال اور احساسِ محرومی و افسردگی کا اظہار کیا جائے.....!!

### حسد کا علاج:

گذشتہ سطور میں ”حسد“ جیسی بدترین خصلت اور مہلک ترین اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی مرض کے تذکرہ کے بعد اب سوال یہ ہے کہ اس آفت سے حفاظت و نجات کیلئے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی روشنی میں اس اہم ترین سوال کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں درج ذیل امور کا اہتمام و التزام کیا جائے:

(۱)..... حاسد انسان کو چاہئے کہ وہ اس بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرے کہ اسے جو تھوڑی بہت نیک اعمال کی توفیق ہو جاتی ہے، اگر اس کے یہ تمام نیک اعمال (رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق) اس کی اس بری خصلت (یعنی حسد) کی وجہ سے ضائع ہوتے رہیں، تو کیا اس سے بڑھ کر کوئی بد نصیبی ہو سکتی ہے.....؟

(۲)..... حاسد انسان کو دنیا میں رنج و غم اور افسردگی و پریشانی، نیز آخرت میں بھی بربادی و ناکامی ہی نصیب ہوتی ہے، لہذا اسے غور کرنا چاہئے کہ اس کی اس بری خصلت کی وجہ سے محسود کا تو کچھ بھی بگڑتا، البتہ اس کی یہ خصلت خود اس کیلئے یقیناً انتہائی مضر اور تباہ کن ہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی تو پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ انسان خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا ہی نقصان اور اپنی ہی بربادی کا سامان کرتا چلا جائے.....؟

(۳)..... حاسد انسان کو چاہئے کہ وہ خود اپنے سے بلند مقام و مرتبہ اور زیادہ حیثیت یا مال و دولت رکھنے والوں کو دیکھ کر غمگین، پریشان اور بیمار ہونے اور بس ہمیشہ کڑھتے رہنے کی بجائے ان لوگوں کو دیکھا کرے جو مال و دولت اور مقام و مرتبے میں اس سے کم حیثیت رکھتے ہوں، تاکہ ان کے مسائل، پریشانیوں اور دشواریوں کا نظارہ و مشاہدہ کر کے اسے خود اپنے پاس موجود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی توفیق ہو، اس طرح اسے احساسِ محرومی اور ذہنی کرب و اذیت سے نجات، نیز روحانی مسرت و آسودگی حاصل ہوگی، جیسے کہ ایک شخص اپنا جو تاگم ہو جانے پر غمگین اور پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی کہ جو اپنی ٹانگوں سے ہی محروم تھا، تب اس نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جو تاگم ہو گیا تو کوئی بات نہیں، الحمد للہ ٹانگیں تو صحیح سلامت ہیں۔

(۴)..... حاسد کو چاہئے کہ کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر افسردہ و غمگین ہونے اور اس کے زوال کی تمنا کرنے کی بجائے اسی جیسی نعمت اللہ سے اپنے لئے بھی طلب کرے، اللہ کے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں ہے، اگر وہ چیز اللہ کے علم میں اس کیلئے بہتر اور مفید ہوگی تو اللہ تعالیٰ اسے بھی عطا فرمادیں گے، ورنہ یہ کہ اللہ کے ہر کام میں یقیناً حکمت و مصلحت پوشیدہ ہے، ہر بندے کی بہتری اور اس کے نفع و نقصان کے بارے میں خود بندے سے بھی بڑھ کر اللہ کو علم ہے، کیونکہ بندوں کا علم ناقص اور اللہ کا علم کامل ہے، لہذا بندے کیلئے اپنی کسی پسندیدہ چیز سے دوری و محرومی میں بھی درحقیقت اس کیلئے خالق کائنات اور علام الغیوب کی طرف سے یقیناً خود بندے کیلئے ہی کوئی خوبی و بہتری ہی مقصود ہے۔

(۵)..... حاسد کو چاہئے کہ وہ کسی دوسرے کے پاس موجود کسی نعمت کو دیکھ کر افسردہ و غمگین ہونے اور حسد جیسی بدترین خصلت کا شکار ہو کر دنیا و آخرت کی بربادی مول لینے کی بجائے



خود اپنے اندر بھی وہی عمدہ اوصاف، نیز محنت و مشقت کا جذبہ، طلبِ صادق، سچی لگن اور تڑپ پیدا کرے کہ جس کی بدولت اُس محسود کو یہ مقام و مرتبہ، یہ ترقی اور یہ نعمتیں نصیب ہوئی ہیں۔ جس طرح قابیل نے جب ہابیل کو قتل کی دھمکی دی تو جواب میں ہابیل نے کہا کہ: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (۱) یعنی: (بیشک! اللہ تو پرہیزگاروں سے ہی قبول فرماتا ہے)۔

مقصد یہ کہ قابیل کی طرف سے قتل کی دھمکی کے جواب میں ہابیل نے اسے یوں کہا کہ تم مجھ سے حسد کرنے اور اس کے نتیجے میں مجھے قتل کر دینے کی بجائے وہی خوبی یعنی تقویٰ، پرہیزگاری اور للہیت اپناؤ کہ جس کی بدولت مجھے یہ مقام و مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ (۲) ☆ مذکورہ بالا تمام باتیں تو حاسد سے متعلق تھیں کہ وہ اس مکروہ ترین عادت اور فتنہ ترین خصلت سے بچنے کیلئے کیا تدابیر اختیار کرے۔

### ☆ حاسد کے شر سے کس طرح بچا جائے؟

جہاں تک محسود کا تعلق ہے کہ اسے حاسد کے شر سے محفوظ و مأْمون رہنے کیلئے کیا کرنا چاہئے؟ تو اس بارے میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ:

- (۱).....تمام شرعی احکام و تعلیمات، نیز اسلامی اخلاق و آداب کی مکمل پابندی کی جائے۔
- (۲).....سورۃ الاخلاص اور مَعُوذَتین یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس، نیز آیۃ الکرسی کی بکثرت تلاوت کا اہتمام و التزام کیا جائے۔
- (۳).....جس شخص کے بارے میں اندیشہ ہو کہ اس کے مزاج میں حسد پایا جاتا ہے، بلا ضرورت اس کے سامنے اپنے پاس موجود نعمتوں کا اظہار یا تذکرہ نہ کیا جائے۔

(۱) المائدۃ [۲۷] (۲) جیسا کہ اردو میں محاورہ مشہور ہے: ”محنت کر، حسد نہ کر“۔

(۴)..... اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صحت و تندرستی، عزت و شہرت، جاہ و منصب، مال و دولت، یا اور کسی بھی شکل میں جو بھی نعمت عطاء کر رکھی ہو، اس پر فخر و غرور، تکبر، خود پسندی، دوسروں کے ساتھ بد سلوکی اور ان کی تحقیر و تذلیل کی بجائے حتیٰ الامکان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی شکر گزاری و احسان مندی، نیز اس کے سامنے عجز و انکسار اور اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کا راستہ اختیار کیا جائے۔

(۵)..... اپنے اعزہ و احباب اور قرب و جوار میں مقیم افراد میں سے ناداروں اور حاجت مندوں کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا جائے اور حتیٰ الامکان ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے، نیز خلوص نیت کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا مندی و خوشنودی کی خاطر وقتاً فوقتاً ان کی مالی مدد و اعانت بھی کی جائے، تاکہ ان کے دلوں میں احساسِ محرومی یا حسد کے جذبات پیدا نہ ہو سکیں، ان شاء اللہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ایسے شخص سے حسد اور اس کی خوشحالی و آسودگی کے زوال کی آرزو کرنے کی بجائے اسے اپنا محسن اور خیر خواہ تصور کریں گے اور اس کیلئے مزید خیر و برکت اور ترقی و خوشحالی کی دعاء کرتے رہیں گے۔



## زبان کی حفاظت:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کو پیدا فرمایا، اسے عدم سے وجود بخشا، اور پھر اپنے فضل و کرم سے اسے بیشمار نعمتوں سے نوازا، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا﴾ (۱) ترجمہ: (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے)

ابنِ آدم پر اس کے خالق و مالک اور منعم و محسن کی طرف سے جو بیشمار احسانات و انعامات ہیں ان میں سے ایک بہت بڑا احسان ”قوتِ گویائی“ ہے۔ یعنی خالقِ کائنات نے انسان کو زبان کی شکل میں ایک انتہائی گراں قدر نعمت عطاء فرمائی، اور پھر اس زبان کے ذریعے اسے بولنے کی قوت عطاء فرمائی، تاکہ وہ اپنا مدعی بیان کر سکے اور مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ (۲) ترجمہ: (رحمن نے قرآن سکھایا، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اور اسے بولنا سکھایا)

☆..... یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ فطری طور پر انسان کا مزاج یہ ہے کہ اس کے دل میں ہمیشہ اپنے محسن کیلئے انتہائی عزت و احترام کے جذبات موجزن رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، بلکہ اسے اس کی نافرمانی کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کو کوئی قیمتی چیز بطور تحفہ یا انعام دیتا ہے تو تحفہ یا انعام وصول کرنے

والے اس شخص میں اگر حياء و مروت ہو تو اسے ضرور اس بات کا لحاظ اور احساس ہوگا کہ میں اپنے اس محسن کی دی ہوئی اس چیز کو اس کی مرضی و منشاء کے خلاف استعمال نہ کروں، بلکہ ہمیشہ صرف اسی طریقے کے مطابق ہی استعمال کروں جو میرے منعم و محسن کی خواہش اور اس کی مرضی، نیز اس کی طرف سے آمدہ تعلیمات و ہدایات کے عین مطابق ہو۔

☆..... اس انسانی فطرت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بارے میں بھی غور و فکر کیا جائے کہ جب انسان کیلئے یہ ”زبان“ اس کے خالق و مالک کی طرف سے بہت ہی بڑی نعمت اور احسانِ عظیم ہے، تو پھر اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس نعمت کو صرف انہی طریقوں کے مطابق ہی استعمال کرے جو اس کے محسن کی مرضی و منشاء اور اس کی طرف سے نازل شدہ ہدایات و تعلیمات کے مطابق ہوں، جن میں انسان کیلئے اپنے اس منعم و محسن کی خوشنودی و رضامندی کا سامان ہو، نیز جن میں خود بولنے والے کیلئے، یا دوسروں کیلئے کسی فتنہ و فساد اور آفت و مصیبت کا اندیشہ نہ ہو، بلکہ سب ہی کیلئے عافیت و سلامتی اور خیر و خوبی کا پیغام ہو۔

☆..... چنانچہ اس موضوع (یعنی: ”انسان کی گفتگو“) کی اسی نزاکت و اہمیت کی بناء پر ہی قرآن و حدیث میں انسان کو جابجا ”زبان“ کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کے غلط استعمال سے مکمل اجتناب کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

ارشادِ باری ہے: ﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (۱) ترجمہ: (لوگوں سے ہمیشہ خوش اسلوبی سے بات کیا کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ

بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا (۱) ترجمہ: (اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالا کریں، کیونکہ شیطان آپس میں فساد ڈھلاتا ہے، بیشک شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾ (۲) ترجمہ: (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور درست بات کہو)

یعنی انسان کو چاہئے کہ ہمیشہ ایسی درست، مناسب، اور سچی بات کہا کرے جس میں خود اس کیلئے بھی اور دوسروں کیلئے بھی عافیت و سلامتی کا سامان ہو، اور ہر ایسی بات سے مکمل گریز کرے جس میں فتنہ و فساد، آفت و مصیبت، یا کسی بھی قسم کی پریشانی کا احتمال ہو۔

نیز ارشاد ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (۳) ترجمہ: (انسان منہ سے کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر یہ کہ اس کے پاس نگہبان تیار ہے) یعنی انسان کی زبان سے ادا ہونے والا ہر ایک ایک لفظ اس کے نامہ اعمال میں محفوظ کرنے کیلئے ہمہ وقت اس کے ہمراہ ایک فرشتہ مستعد و تیار رہتا ہے، لہذا انسان کیلئے ضروری ہے کہ اپنی زبان سے ایک ایک لفظ ادا کرتے وقت خوب غور و فکر کرے، اور اس کے ذہن میں ہمیشہ اپنی ہر بات کے بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس بیدار رہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ) (۴) ترجمہ: (جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ [ہمیشہ] اچھی بات کہا کرے، ورنہ خاموش رہا کرے)

نیز ارشاد نبویؐ ہے: (إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللَّهِ لَا يُلْقِي لَهَا بَالًا

(۱) الاسراء، بنی اسرائیل [۵۳] (۲) الاحزاب [۷۰] (۳) ق [۱۸] (۴) بخاری [۶۱۰] وغیرہ

يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ) (۱) ترجمہ: (بعض اوقات انسان اپنی زبان سے کوئی ایسی بات کہتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنتی ہے، اگرچہ اس [انسان] کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، مگر یہی بات اس کیلئے جہنم میں جا کرنے کا سبب بن جاتی ہے)

☆..... ”زبان“ یا بالفاظ دیگر انسان کی گفتگو کی اس قدر اہمیت اور اس کی نزاکت کے پیش نظر اس سلسلہ میں اسلامی آداب و تعلیمات کا علم و ادراک اور اس بارے میں شعور و آگاہی ہر مسلمان کیلئے انتہائی ضروری و لازمی ہے۔ ان آداب و تعلیمات کی رو سے انسان کیلئے اپنی زبان کے استعمال کے سلسلہ میں درج ذیل امور سے اجتناب کا مکمل اہتمام و التزام ضروری و لازمی ہے:

### (۱) فضول گفتگو:

فضول اور بلا ضرورت گفتگو نا پسندیدہ عادت اور مومن کی شان کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں اہل ایمان کی جن صفات کا تذکرہ ہے ان میں سے ایک یہ صفت بھی ہے کہ: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور وہ فضول اور بیہودہ کاموں سے منہ موڑے رکھتے ہیں) اس آیت میں ”لغو“ کے معنی و مفہوم میں یقیناً فضول گفتگو بھی شامل ہے، لہذا فضول گفتگو سے اجتناب ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا بھی یہی مفہوم اور یہی تقاضا ہے: (مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ) (۳) ترجمہ: (انسان کیلئے بہتر مسلمان ہونے کی علامات میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ وہ ہر اس چیز سے کنارہ کشی اختیار کرے جس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو)۔

نیز ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللَّهِ تَعَالَى، فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللَّهِ تَعَالَى قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ، وَإِنَّ أْبَعَدَ النَّاسِ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ تَعَالَى: الْقَلْبُ الْقَاسِي) (۱) ترجمہ: (اللہ کے ذکر کے سوا دوسری باتیں ضرورت سے زیادہ نہ کیا کرو، کیونکہ اللہ کے ذکر کے سوا کثرتِ کلام سے دل سخت ہو جاتا ہے، اور اللہ کی رحمت سے سب سے زیادہ دور اور محروم وہی شخص رہتا ہے جس کا دل سخت ہو)۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے ایک بار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: مَا النَّجَاةُ؟ یعنی (ہر قسم کی آفتوں اور پریشانیوں سے) سلامتی و نجات حاصل کرنے کیلئے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: (أَمْسِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلَا يَسْغُكَ بَيْتُكَ، وَابْكْ عَلَى خَطِيئَتِكَ) (۲) ترجمہ: (اپنی زبان کو سنبھال کر رکھو، تمہیں تمہارا گھر کافی ہو جائے (۳) اور اپنے گناہوں پر رو دیا کرو) (۴) اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ) (۵) ترجمہ: (مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کے شر سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں)

بسیار گوئی یعنی زیادہ بولنا انسان کی ناپختگی و ناسمجھی کی دلیل ہے، جبکہ اس کے برعکس خاموشی

(۱) ترمذی [۲۴۱۱] (۲) ترمذی [۲۴۰۶] باب ماجاء فی حفظ اللسان۔

(۳) یعنی بلا ضرورت اپنے گھر سے باہر گلی کو چوں اور بازاروں میں گھومتے رہنے سے پرہیز کیا جائے۔

نیز اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو چھوٹا بڑا قیمتی یا معمولی جیسا بھی گھر نصیب ہو وہ اسی پر راضی و قانع رہے اور دوسروں کے گھروں کی طرف نہ دیکھا کرے۔

(۴) یعنی گناہوں سے بچنے کی کوشش کے باوجود اگر فطری انسانی کمزوری کے باعث کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر خوش ہونے یا اس پر اصرار کی بجائے جلد از جلد غلوں دل کے ساتھ توبہ و استغفار کا اہتمام کیا جائے۔

(۵) بخاری [۱۰] باب من سلم المسلمون من لسانه ويده۔ نیز: مسلم [۴۱]

اور کم گوئی یقیناً عقلمندی و سمجھداری کی نشانی ہے۔

مثال مشہور ہے: إِذَا تَمَّ عَقْلُ الْمَرْءِ نَقَصَ كَلَامُهُ یعنی: ”انسان کی عقل جب پختہ ہو جاتی ہے تو اس کی گفتگو کم ہو جاتی ہے“۔ نیز مثال مشہور ہے: مَنْ سَكَتَ سَلِمَ، وَمَنْ سَلِمَ نَجَى یعنی: ”جو شخص خاموش رہا وہی سلامت رہا، اور جو سلامت رہا اسی نے نجات پائی“۔ نیز: إِذَا كَانَ الْكَلَامُ مِنَ الْفِضَّةِ فَالْسُّكُوتُ مِنَ الذَّهَبِ یعنی: ”انسان کی گفتگو اگر چاندی کی طرح قیمتی ہے تو اس کی خاموشی یقیناً سونے کی طرح قیمتی ہے“۔

لہذا ”کثرتِ کلام“، یعنی فضول اور بلا ضرورت گفتگو سے اجتناب ضروری ہے، کیونکہ یہ عادت انسان کیلئے کسی بھی وقت کسی بڑی آفت و مصیبت کا سبب بن سکتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کم گوئی میں انسان کیلئے عافیت و سلامتی کا راز پوشیدہ ہے۔ کسی کا شعر ہے:

ایک خاموشی سے ٹلتی ہیں ہزاروں مشکلات

جورہا خاموش، سمجھو مل گئی اس کو نجات

جس طرح کمان سے نکلا ہوا تیر کسی صورت واپس نہیں آ سکتا، بندوق سے نکلے ہوئی گولی واپس نہیں ہو سکتی، یعنی ہم اسی طرح جو بات ایک بار زبان سے نکل گئی وہ کسی صورت واپس نہیں آ سکتی۔ لہذا انسان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان سے کوئی بھی لفظ ادا کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لیا کرے، جیسا کہ اردو میں محاورہ مشہور ہے: ”پہلے سوچو، پھر تولو، پھر بولو“۔ نیز کسی دانشمند کا قول ہے کہ: ”اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو، مگر زبان بند رکھو“۔ شاعر کہتا ہے:

مَا إِنْ نَدِمْتُ عَلَى سُكُوتِي مَرَّةً      وَلَقَدْ نَدِمْتُ عَلَى الْكَلَامِ مَرَارًا

یعنی آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے اپنی ”خاموشی“ پر افسوس ہوا ہو، البتہ زندگی میں ایسے



مواقع بارہا آئے کہ جب مجھے اپنے ”بولنے“ پر انتہائی ندامت اور حسرت کا سامنا کرنا پڑا۔  
نیز کسی کا شعر ہے:

اِحْفَظْ لِسَانَكَ اَيْهَا الْاِنْسَانُ لَا يَلِدُ غَنَّاكَ هَذَا الثُّعْبَانُ

ترجمہ: (اے انسان! اپنی زبان کو خوب سنبھال کر اور احتیاط کے ساتھ استعمال کیا کرو، تاکہ  
کسی روز یہ ”سانپ“ تمہیں ڈس نہ لے۔  
نیز کسی کا شعر ہے:

يَمُوتُ الْفَتَى مِنْ عَثْرَةِ بِلْسَانِهِ وَلَيْسَ يَمُوتُ الْمَرْءُ مِنْ عَثْرَةِ الرَّجُلِ  
ترجمہ: (بعض اوقات کوئی نوجوان شخص ٹھوکر لگنے کی وجہ سے موت کے منہ میں جا پہنچتا  
ہے۔ حالانکہ وہ ٹھوکر اسے پاؤں سے نہیں، بلکہ زبان سے لگی ہوتی ہے) (یعنی انسان کیلئے  
پاؤں میں لگنے والی ٹھوکر کی نسبت زبان کی ٹھوکر بہت زیادہ خطرناک، مہلک، اور جان  
لیوا ثابت ہوا کرتی ہے)۔

لہذا جس کسی کو دنیا و آخرت میں عافیت اور سلامتی و نجات مطلوب ہو اس کیلئے فضول  
گفتگو سے بہر صورت اجتناب اور مکمل گریز انتہائی ضروری ہے۔

## (۲) کثرت مزاح:

”کثرت مزاح“، یعنی باہمی ہنسی مذاق اگر معقول حد کے اندر ہو تو یقیناً اس میں کوئی مضائقہ  
نہیں، بلکہ بعض اوقات تو کسی کی دلجوئی کیلئے ہنسی مذاق مطلوب و محمود ہے، البتہ اس موقع  
پر شرعی آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ ہنسی مذاق میں بھی مبالغہ آمیزی اور دروغ  
گوئی سے اجتناب کیا جائے، نیز ایسی بات سے گریز کیا جائے جس میں کسی کی دل آزاری  
کا اندیشہ ہو۔ جبکہ اگر ہنسی مذاق کے موقع پر ان شرعی آداب کو پس پشت ڈال دیا جائے، یا

”حدِ اعتدال“ کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو یقیناً ایسی ہنسی مذاق سے اجتناب ضروری ہے، کیونکہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ حیا دار اور باوقار ہو، جبکہ ضرورت سے زیادہ ہنسی مذاق یقیناً وقار کے منافی ہے۔

نیز ضرورت سے زیادہ اور بے موقع ہنسی مذاق میں بعض اوقات زبان سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے کہ متکلم کو اس کی اہمیت و نزاکت کا احساس نہیں ہوتا، لیکن وہی بات مخاطب کے دل میں کسی تیر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے.....! اور پھر تعلقات میں خوشگواہی کی بجائے تلخی و کشیدگی کا عنصر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْإِلْتِيَامُ      وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ  
یعنی: ”نیزوں کے زخم تو کبھی نہ کبھی بھر ہی جاتے ہیں، لیکن زبان کے زخم کبھی نہیں بھرتے، بلکہ ہمیشہ تازہ ہی رہتے ہیں.....“

نیز مثال مشہور ہے: لِكُلِّ شَيْءٍ بَذْرٌ، وَبَذْرُ الْعَدَاوَةِ: الْمِزَاحُ یعنی: ”ہر چیز کا ایک بیج ہوا کرتا ہے، اور باہمی نفرت و عداوت کا بیج ضرورت سے زیادہ ہنسی مذاق ہے۔“

چنانچہ مشاہدہ یہی ہے کہ بسا اوقات محض باہمی ہنسی مذاق میں اور بس کھیل ہی کھیل میں کسی کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے اچانک صورتِ حال یکسر تبدیل ہو جاتی ہے، قہقہوں اور مسکراہٹوں سے بھرپور محفل دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ کارزار کا نقشہ پیش کرنے لگتی ہے۔

لہذا ”کثرتِ مزاح“، یعنی ضرورت سے زیادہ فضول ہنسی مذاق سے اجتناب ضروری ہے۔ بلکہ یہ بات تو خاص طور پر ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ جس کسی کے ساتھ جس قدر نازک اور حساس نوعیت کے تعلقات ہوں، اس کے ساتھ فضول ہنسی مذاق سے اسی قدر

گریز ضروری ہے، تاکہ ان حساس اور نازک تعلقات میں کبھی کسی ناگواری یا تلخی کا کوئی عنصر شامل نہ ہونے پائے۔

### (۳) جھوٹ: (۱)

یقیناً ”سچ“ ہر فضیلت کا منبع اور ہر خیر و خوبی کا سرچشمہ ہے، جبکہ اس کے برعکس جھوٹ ہر خرابی کی اصل اور ہر برائی کی جڑ ہے۔ جھوٹ کی قباحت و شناعة اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں ”صدق“ کے بالمقابل ”نفاق“ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح و ثابت ہوتی ہے کہ ”صدق“ ایمان کی علامت، دنیا و آخرت میں سعادت مندی اور صلاح و فلاح کا سبب ہے۔ جبکہ ”جھوٹ“ کفر و نفاق کی علامت اور دنیا و آخرت میں بربادی اور ذلت و رسوائی کا سبب ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری ہے: ﴿لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُوراً رَحِيماً﴾ (۲) ترجمہ: (تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے، اور منافقوں کو اگر چاہے تو سزا دے، یا ان کی توبہ قبول فرمائے، یقیناً اللہ تو بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے)

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا: (آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا أُؤْتِمِنَ خَانَ) (۳) ترجمہ: (منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے گا جھوٹ بولے گا، جب وعدہ کریگا تو

(۱) ”جھوٹ“ کی قباحت و شناعة کے بارے میں مزید تفصیل ”صدق“ کی فضیلت و اہمیت کے بیان میں صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ ہو۔ (۲) الاحزاب [۲۴]

(۳) بخاری [۳۳] باب ظلم دون ظلم، نیز بخاری: [۲۵۳۶] [۲۵۹۸] [۵۷۴۳] [۵۷۴۳] [۵۷۴۳] مسلم [۵۹] باب بیان خصال المنافق۔ ترمذی [۲۶۳۱] باب ما جاء في علامة المنافق۔ احمد [۸۶۷۰]

وعدہ خلافی کرے گا، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے گی تو اس میں خیانت کرے گا۔

### (۴) غیبت:

”غیبت“ سے مراد ہے: ”کسی کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا جو اسے ناگوار محسوس ہو“۔ (۱)

یہاں یہ حقیقت ہمیشہ ذہنوں میں رہنی چاہئے کہ فطری طور پر انسان کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس بات کو قطعاً قبول نہیں کرتا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہی جائے۔

نیز یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب بھی کسی کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہی جاتی ہے تو قانونِ قدرت یہی ہے کہ آج یا کل، جلد یا بدیر، کبھی نہ کبھی یہ بات ضرور اُس شخص تک پہنچ کر رہی رہیگی، اور اس وقت اس بات میں بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوں گی، کہنے والے نے معمولی سی کوئی بات کہی، اور پہنچانے والے نے خوب بڑھا چڑھا کر بات پہنچائی، کہنے والے نے ہلکے پھلکے انداز میں کچھ کہا، مگر پہنچانے والے کا انداز یقیناً مختلف ہوگا، کہنے والے کی نیت میں شاید کوئی فساد نہ ہو، جبکہ پہنچانے والا کسی اور نیت سے یہ بات پہنچائیگا..... اور پھر صورتِ حال بہت نازک اور خطرناک ہو جائیگی، بڑے مسائل پیدا ہوں گے، رنجشوں اور تلخیوں کا ایک طوفان برپا ہو جائیگا، باہمی تعلقات میں خوشگواہی کی بجائے تلخی و بد مزگی کی آمیزش ہو جائیگی، محبتیں نفرتوں میں بدل

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: اُتَدْرُونَ مَا لَ الْغَيْبَةِ؟ قَالُوا: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ ﷺ: ذَكَرَكَ أَخَاكَ بَمَا

يَكْرَهُ..... (مسلم: ۲۵۸۹) باب استحباب العفو والتواضع۔

جائینگے، طبیعتوں میں بد مزاجی و کدورت آجائینگے، انسانی رشتوں کی عمارت منہدم ہونے لگے گی.....!!

اور پھر نتیجہ کیا ہوگا؟ صحت کی خرابی، سکون و اطمینان کا فقدان، اور بالآخر دنیا و آخرت کی بربادی.....!!

لہذا اس بارے میں اسلامی تعلیمات، نیز حکمت و دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کسی کو کسی کی کوئی بات یا اس میں موجود کوئی عادت یا اس کی کوئی حرکت ناپسند ہو تو کسی تیسرے شخص کے سامنے اس بارے میں کسی قسم کے تذکرہ یا تبصرہ کی بجائے براہ راست خود اسی سے اس بارے میں گفتگو کر لی جائے، اور گفتگو کرتے وقت انداز خاصہٴ ناصحانہ ہو، ہمدردی اور خلوص نمایاں ہو، تحقیر و تذلیل مقصود نہ ہو، جس طرح معالج اپنے مریض کے ساتھ مکمل ہمدردی و محبت اور شفقت و خلوص کا اظہار کرتا ہے، اس کی تحقیر و تذلیل نہیں کرتا، اس کے علاج کے سلسلہ میں اس سے حاصل شدہ معلومات یا اس کے رازوں کی تشہیر نہیں کرتا.....! نیز جس طرح والدین اپنے کسی بچے میں موجود کسی اخلاقی عیب کی وجہ سے اسے محلے میں یا خاندان اور برادری والوں کے سامنے رسوا اور بدنام نہیں کرتے، بلکہ وہ تو اس کی پردہ پوشی کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور انتہائی محبت و خلوص اور شفقت و ہمدردی کے ساتھ اس کی اصلاح کی فکر و جستجو میں مشغول رہتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح کسی بھی مسلمان میں موجود کسی عیب یا اس کی کسی ناپسندیدہ عادت یا حرکت پر اس کی تحقیر و تذلیل اور دوسروں کے سامنے اس کی تشہیر کی بجائے اسے براہ راست خلوت میں مناسب طریقہ سے تنبیہ کر دی جائے، انداز ناصحانہ ہو، ناقدانہ نہ ہو۔ اس طرح باہمی تعلقات میں کوئی خرابی و بد مزگی پیدا نہیں ہوگی، نہ ہی کسی رنجش یا تلخی کا اندیشہ رہے گا، ارشادِ باری: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ

رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴿۱﴾ (یعنی: ”اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے“) سے مطابقت بھی ہو جائیگی، فریضہ ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کی ادائیگی، نیز رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل بھی ہو جائیگی: (مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) (۲) ترجمہ: (جس نے [دنیا میں] کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ [قیامت کے روز] اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے)۔

اس معاملہ کی اس قدر اہمیت و نزاکت، یا الفاظ دیگر ”غیبت“ کی اس قدر قباحت و شناعیت اور اس کے پیشتر مفاسد اور بدترین نتائج کی وجہ سے ہی قرآن وحدیث میں اس سے مکمل اجتناب کی نہایت ہی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے اور اس کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ.....﴾ (۳) ترجمہ: (اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن ہی آئے گی.....)

یعنی قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے غیبت کرنے والے کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ حالانکہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا تو یقیناً یہی ہے کہ فوت شدہ بھائی کی مناسب طریقہ سے تجہیز و تکفین کے بعد اسے جلد از جلد مکمل عزت و احترام کے ساتھ اس کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچا دیا جائے، تا کہ اس کی لاش کسی بھی قسم

(۱) النحل [۱۲۵]

(۲) بخاری [۲۳۱۰] مسلم [۲۵۸۰] بعض روایات میں: سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ کے الفاظ ہیں۔

(۳) الحجرات [۱۲]

کی بے حرمتی سے محفوظ و سلامت رہے۔

لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوح نوح کر کھانا شروع کر دے تو یقیناً یہ انتہائی بے حسی، سفاکی، اور سنگدلی کا مظاہرہ ہوگا۔ بعینہ اسی طرح ”غیبت“ کرنے والا شخص بھی اللہ کی نظر میں گویا کہ اپنے بھائیوں کا گوشت نوح نوح کر کھانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے، اور اس طرح وہ اپنی بے حسی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا انسان انتہائی بے حس اور سنگدل ہونے کے علاوہ مزید یہ کہ ”بزدل“ بھی ہے۔ کیونکہ اگر اس میں ہمت و شجاعت ہوتی تو یقیناً وہ اپنے مردہ بھائی کی بجائے کسی زندہ انسان کا گوشت کھا کر دکھاتا، اور تب وہ زندہ انسان اپنا دفاع کرتا، اپنی حفاظت کا انتظام کرتا، بلکہ شاید کوئی مناسب جوابی کارروائی بھی کرتا۔ لیکن اسے کسی زندہ انسان کا گوشت کھانے کی جرأت تو ہوئی نہیں، اسی لئے مردہ کا گوشت نوح رہا ہے، اس سے بات واضح ہوگئی کہ یہ شخص اس انتہائی مکروہ و مذموم اور قبیح ترین حرکت (یعنی مردہ بھائی کا گوشت کھانے) کے علاوہ مزید قابلِ ملامت و مذمت اس لئے بھی ہے کہ اس میں ایک اور بری صفت بھی موجود ہے، اور وہ ہے: ”بزدلی“۔ بعینہ اسی طرح ”غیبت“ میں مبتلا شخص بھی مزید قابلِ ملامت و مذمت اس لئے بھی ہے کہ وہ ”بزدل“ بھی ہے۔ کیونکہ اگر وہ بہادر ہوتا اور اس میں ہمت و شجاعت ہوتی تو کسی کے بارے میں پیٹھ پیچھے باتیں بنانے کی بجائے اس کی موجودگی میں اور اس کے سامنے بات کرتا، اور تب وہ اپنی حفاظت کا کوئی انتظام کرتا، کوئی صفائی پیش کرتا، حاضرین کے سامنے درست اور اصل حقیقتِ حال واضح کرتا، بلکہ شاید وہ اس کے خلاف کوئی مناسب جوابی کارروائی بھی کرتا۔ یہی اس آیت کا مفہوم ہے۔

غیبت کے مرتکب شخص کی حسرت و دنائت، نیز آخرت میں اس کیلئے انجامِ بد اور عبرتناک سزا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو: (لَمَّا عُرِجَ بِي مَرَرْتُ بِأَقْوَامٍ لَهُمْ أَظْفَارٌ مِنْ نَحَاسٍ يَخْمِشُونَ وُجُوهَهُمْ وَصُدُورَهُمْ ، فَقُلْتُ مَنْ هَؤُلَاءِ يَا جَبْرِيلُ؟ قَالَ: هَؤُلَاءِ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ لُحُومَ النَّاسِ وَيَقَعُونَ فِي أَعْرَاضِهِمْ) (۱) ترجمہ: (معراج کے موقع پر میرا گزرا ایک ایسی قوم پر ہوا کہ جن کے ناخن تانے کے تھے، جن سے وہ اپنے چہرے اور سینے نوچ رہے تھے، میں نے کہا کہ: ”اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟“ [جبریل نے] کہا کہ: ”یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں“ (۲)

☆..... یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جب کوئی شخص کسی کے سامنے کسی کی غیبت کرتا ہے تو عموماً ہر سلیم الطبع انسان اس غیبت کرنے والے کے بارے میں فوراً ہی یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ یقیناً یہ شخص حاسد، کینہ پرور، کم ظرف، سازشی اور تنگدل قسم کا انسان ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیبت کرنے والا شخص خود ہی مخاطب کی نظروں سے گر جاتا ہے اور اپنی عزت کھو بیٹھتا ہے۔

کہہ رہا تھا شورِ دریا سے سمندر کا سکوت

جس کا جتنا طرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

لہذا جس کسی کو اپنی عزت و آبرو کا کچھ احساس ہو اسے چاہئے کہ دوسروں کے سامنے کسی کی غیبت کر کے خود اپنے آپ کو ذلیل و رسوا نہ کرے اور اپنے ہی ہاتھوں اپنی عزت و آبرو کی

(۱) احمد [۱۳۳۶ھ] - ابو داؤد [۲۸۷۸] باب فی الغیبة - (۲) یعنی لوگوں کی غیبت کرتے ہیں اور اس طرح

ان کی عزتیں پامال کیا کرتے ہیں۔ غور طلب بات ہے کہ سورۃ الحجرات میں وارد مضمون کی طرح یہاں اس حدیث میں بھی غیبت کرنے والے کو انسانوں کا گوشت کھانے والے سے تشبیہ دی گئی ہے۔



بربادی کا سامان نہ کرے۔ کیونکہ دولت، صحت وغیرہ غرضیکہ دنیا کی ہر نعمت چھن جانے کے بعد دوبارہ مل سکتی ہے۔ لیکن عزت وہ واحد چیز ہے جو ایک بار ختم ہو جانے کے بعد دوبارہ کبھی نہیں مل سکتی۔ مثال مشہور ہے کہ: ”پہاڑ سے گرنے کے بعد انسان دوبارہ اٹھ سکتا ہے، لیکن نظروں سے گرنے کے بعد دوبارہ کبھی نہیں اٹھ سکتا۔“

☆..... البتہ اہل علم کے بقول بعض صورتوں میں ”غیبت“ کی اجازت ہے۔ اس سلسلہ میں اگرچہ اہل علم نے کافی تفصیل بیان کی ہے (۱) تاہم مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

(الف): جب کسی انسان کے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی یا کسی قسم کی حق تلفی ہوئی ہو، وہ حصول انصاف کی غرض سے کسی ایسے شخص کے سامنے ظالم کے بارے میں شکوہ و شکایت کرے کہ جس سے اسے یہ امید ہو کہ یہ شخص میری دادرسی کر سکتا ہے، اور مجھے انصاف دلا سکتا ہے۔

ارشادِ بانی ہے: ﴿لَا يَحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ﴾ (۲)

ترجمہ: (برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے والے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا، مگر مظلوم کو اجازت ہے)۔

(ب): کوئی شخص کسی کے ساتھ کوئی تعلق یا رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے، مثلاً ازدواجی رشتہ کاروباری شراکت، یا لین دین، یا کسی بھی قسم کا کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے، اور اس بارے میں تحقیق و جستجو کے طور پر اور اپنی تسلی و اطمینان کی غرض سے اس نے کسی سے مشورہ طلب کیا، اور جس سے مشورہ طلب کیا گیا ہے وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہو کہ جس کسی کے بارے میں مشورہ طلب کیا گیا ہے وہ اچھا انسان نہیں ہے، لہذا یہ رشتہ یا تعلق کسی صورت مناسب نہیں ہے اور اس میں مشورہ طلب کرنے والے شخص کیلئے سراسر خسارے اور بربادی

(۱) تفصیل کیلئے ریاض الصالحین میں ”باب مایباح من الغیبة“ (باب ۲۵۶) ملاحظہ ہو۔ (۲) النساء [۱۴۸]

کا قوی امکان ہے۔ ایسے میں اس شخص کو چاہئے کہ مشورہ طلب کرنے والے کو دینی یا دنیوی خسارے اور بربادی سے بچانے کی غرض سے مکمل ایمانداری کے ساتھ درست اور صحیح مشورہ دے اور اپنی دانست کے مطابق اسے اصل اور حقیقی صورتِ حال سے آگاہ کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (المُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ) (۱) یعنی: ”جس کسی سے مشورہ طلب کیا جائے وہ [اس چیز کو اپنے ذمے امانت تصور کرتے ہوئے] مکمل ایمان داری کے ساتھ مشورہ دے“۔

(ج): کسی بچے کی اصلاح کی غرض سے اس کے والدین سے اس کی شکایت کرنا، تاکہ والدین بروقت کوئی تادیبی کارروائی یا مناسب اقدام کر سکیں۔

(د): بعض اہل علم کے بقول ایسے فاسق و فاجر افراد کی غیبت بھی مباح ہے کہ جن کا فسق و فجور ظاہر و معروف ہو، جنہیں اپنے فسق و فجور پر شرمندگی و ندامت کی بجائے فخر اور ناز ہو، اور وہ اپنے فسق و فجور کو مخفی و پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی بجائے خود ہی اس کا اعلان و بیان اور تشہیر کرتے پھرتے ہوں.....!

البتہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی لغویات و خرافات سے بہر حال اجتناب ہی کیا جائے۔  
ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ (۲) (یعنی: ”اور وہ فضول اور بیہودہ کاموں سے منہ موڑے رکھتے ہیں) نیز ارشادِ نبوی ﷺ: (مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ) (۳) (یعنی: ”انسان کیلئے بہتر مسلمان ہونے کی علامات میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ وہ ہر اس چیز سے کنارہ کشی اختیار کرے جس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو“) کا بھی یہی تقاضا ہے۔

### (۵) نمیمہ:

”نمیمہ“ سے مراد ہے: ”چغلی“، یعنی لوگوں کے دلوں میں باہم منافرت، تفریق، عداوت، اور بغض و کینہ جیسے خطرناک و مہلک ترین جذبات پیدا کرنے اور انہیں آپس میں لڑانے کی غرض سے ادھر ادھر باتیں پہنچانا، جسے اردو میں عام طور پر ”لگائی بھجائی کرنا“ کہا جاتا ہے۔ اس فتنہ ترین حرکت کی وجہ سے معاشرے میں باہمی محبت و الفت اور ایک دوسرے کیلئے عزت و احترام اور نیک جذبات کی بجائے دلوں میں کینہ، بغض و عداوت، اور نفرتوں کی چنگاریاں سلگنے لگتی ہیں، جس کے نتیجے میں قربتیں دوریوں میں بدل جاتی ہیں، رشتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، اور خاندان ٹوٹنے اور بکھرنے لگتے ہیں۔

چونکہ یہ فتنہ عادت انسانی معاشرے کیلئے انتہائی مضر ہے اور اس کے نقصانات بیشمار ہیں اسی لئے اسلام میں اس سے باز رہنے کی حد درجہ تاکید و تلقین کی گئی ہے، بلکہ اس فتنہ حرکت کے مرتکب انسان کیلئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ”عذاب قبر“ کی خبر دی گئی ہے۔

حدیث ملاحظہ ہو:

☆ عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: (مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى قَبْرَيْنِ فَقَالَ: إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ لَا يَسْتَنْزِعُ مِنْ بَوْلِهِ) (۱)

ترجمہ: (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار دو قبروں کے قریب سے جب گزرے تو آپ نے فرمایا: (اس وقت یہ دونوں قبروں والے عذاب میں مبتلا ہیں، حالانکہ جس وجہ سے عذاب میں مبتلا ہیں وہ [بظاہر] کوئی خاص بہت بڑی وجہ

نہیں ہے، ان میں سے ایک شخص تو [اس لئے عذاب میں مبتلا ہے کہ] چغلیاں کیا کرتا تھا،

جبکہ دوسرا شخص پیشاب سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا تھا) (۱) (۲)

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (شَرَّارُ عِبَادِ اللَّهِ : الْمَشَّائُونَ بِالنَّمِيمَةِ ،

الْمُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْأَحْبَةِ ، الْبَاغُونَ لِلْبُرَاءِ الْعَنْتَ) (۳) ترجمہ: (اللہ کے

تمام بندوں میں سے بدترین لوگ وہ ہیں جو کہ [لوگوں کے درمیان] چغلیاں کرتے

پھرتے ہیں، باہم محبت کرنے والوں میں جدائی اور دوریاں پیدا کرتے ہیں، اور بیگناہوں

پر جھوٹا الزام لگانے کیلئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں)۔

☆..... اس سلسلہ میں مزید یہ بات بھی یاد رکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ کسی کی زبانی

دوسروں کی چغلی یا غیبت سُن کر خوش ہونے یا اسے محض کھیل تماشا یا تفریح طبع کا ذریعہ سمجھنے

کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہی شخص جو آج ہمارے سامنے دوسروں کے عیوب

بیان کر رہا ہے کل ضرور بضرور دوسروں کے سامنے ہمارے عیوب بھی بیان کریگا۔ مثال

مشہور ہے: مَنْ نَمَّ لَكَ نَمَّ عَلَيْكَ یعنی تمہارے سامنے دوسروں کی چغلی کرنے

والا یہاں سے اٹھ کر جب کسی دوسری محفل میں جائیگا تو یقیناً وہاں تمہاری چغلیاں کرے گا۔

(۱) اس حدیث میں کسی روایت میں: لایستغفرہ اور کسی میں: لایستبرئ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ جبکہ

ایک اور روایت میں: لایستتر کے الفاظ ہیں، جو کہ ”ستر“ سے ہے، یعنی وہ شخص پیشاب کرتے وقت لوگوں کی

نگاہوں سے چھپنے کا اہتمام نہیں کیا کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو: دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین - از: محمد بن علان

الصدیق الشافعی - ج: ۸ - ص: ۲۹ - باب تحریم النمیمہ -

(۲) یعنی وہ کوئی ایسی بہت بڑی مشکل بات نہیں تھی کہ جس سے بچنا ان دونوں کیلئے بہت مشکل کام تھا، بلکہ وہ

تو بہت ہی معمولی اور آسان سی بات تھی کہ اگر یہ اس سے بچنا چاہتے تو سہولت بچ سکتے تھے، مگر انہوں نے اس سے

بچنے کی فکر اور کوشش ہی نہیں کی، جس کے نتیجہ میں اب یہ دونوں اپنی اپنی قبر میں بڑے عذاب میں مبتلا ہیں۔

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد بے گماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

☆..... یہاں ضمنیہ تذکرہ بھی مناسب رہیگا کہ دراصل اسلام میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک و صاف رہنے کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔ جیسا کہ اس حدیث مذکور میں ان دونوں افراد میں سے ایک کے بارے میں عذابِ قبر میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ ظاہری اور جسمانی طہارت و صفائی کا اہتمام نہیں کرتا تھا، جبکہ دوسرے شخص کے بارے میں وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ روحانی یا اندرونی نجاست میں مبتلا تھا۔ لہذا مسلمان کیلئے ظاہری و باطنی ہر قسم کی نجاست سے پاکیزگی و صفائی کا اہتمام و التزام اور فکر و جستجو ضروری و لازمی ہے۔ یہی مضمون اس ارشادِ ربانی کا بھی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (یقیناً اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور پاک و صاف رہنے والوں کو)۔

بلکہ قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے مقاصدِ بعثت کے تذکرہ و بیان کے ضمن میں ایک اہم ترین مقصد ”تزکیہ“ بھی بیان کیا گیا ہے۔ (۲)

لہذا جس کسی کو دنیا و آخرت میں عافیت اور سلامتی و نجات مطلوب ہو اس کیلئے ہر قسم کی فضول اور لغو گفتگو سے بہر صورت اجتناب اور مکمل گریز انتہائی ضروری ہے۔

### (۶) طعن و تشنیع:

مسلمان کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ دوسروں پر لعن طعن کرنا، ان کا مذاق اڑانا، انہیں تمنا شایانہ ان کی عزت و آبرو کو پامال کرنا، اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ سب انتہائی مکروہ

(۱) البقرة [۲۲۲]

(۲) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَزَّكَهُمْ﴾ ..... آل عمران [۱۶۴]

اور فتنہ ترین عادات ہیں۔

حجۃ الوداع کے یادگار موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَیْكُمْ كَحُرْمَةِ یَوْمِكُمْ هَذَا ، فِی بَلَدِكُمْ هَذَا ، وَفِی شَهْرِكُمْ هَذَا) (۱) ترجمہ: ”تمہارا خون، تمہارا مال، اور تمہاری عزت و آبرو باہم ایک دوسرے کیلئے اسی طرح قابل احترام ہے کہ جس طرح یہ آج کا دن، یہ جگہ، اور یہ مہینہ قابل احترام ہے)

مقصد یہ کہ ہر مسلمان کے دل میں جس طرح یوم عرفہ حرم مکہ، اور حج کے مقدس ترین مہینے کی اہمیت و عزت پیوست اور راسخ و ثابت ہے، بعینہ اسی طرح دلوں میں باہم ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کی بھی اہمیت ہو اور ایک دوسرے کیلئے عزت و احترام کے مضبوط جذبات ہوں اور پھر باہم رویہ و سلوک بھی انہی جذبات کے تابع ہو۔

اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ ہے: (كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: عَرْضُهُ وَمَالُهُ وَ دَمُهُ) (۲) ترجمہ: (ایک مسلمان کیلئے دوسرے مسلمان کا سبھی کچھ حرام ہے: اُس کی عزت و آبرو بھی، اُس کا مال بھی، اور اس کا خون بھی)۔

لہذا مسلمانوں میں باہم طعن و تشنیع، تمسخر و تضحیک، استہزاء، سب و شتم، فحش گوئی، نیز ایک دوسرے کی عیب جوئی جیسی ان فتنہ ترین عادات سے اجتناب از حد ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۳) ترجمہ: (بربادی ہے ہر عیب چنے والے، طعنہ دینے والے کیلئے)

اس آیت کے مفہوم میں دوسروں کو تمسخر و تضحیک کا نشانہ بنانا، مذاق اڑانا، زبان سے کسی کو لعن

(۱) بخاری [۶۷] باب قول النبی ﷺ: رَبِّ مَلِغٌ اَوْعَى مِنْ سَامِعٍ (۲) ترمذی [۱۹۲۷] (۳) ہمزہ [۱]

طعن اور ذلیل و بے عزت کرنا، ہاتھ پاؤں یا آنکھ کے اشارے سے یا کسی بھی شکل میں کسی کا مذاق اڑانا یا نقل اتارنا، دوسروں کے عیوب کی تلاش میں لگے رہنا اور پھر معاشرے میں یا برادری میں انہیں رسوا اور شرمسار کرنا، عزت و آبرو کو پامال کرنا..... وغیرہ..... سب ہی کچھ شامل ہے۔

نیز ارشادِ بانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ.....﴾ (۱) ترجمہ: (اے ایمان والو! کوئی ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے، عین ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں)

یعنی مذاق اڑانے کی وجہ عموماً یہ ہوا کرتی ہے کہ مذاق اڑانے والا خود کو افضل اور اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے اور دوسروں کو حقیر و کمتر تصور کرتا ہے، اسلئے وہ دوسروں کا مذاق اڑاتا ہے اور انہیں رسوا اور بے عزت کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ تمہیں کیا خبر کہ درحقیقت کون بہتر ہے اور کون کمتر؟ کون اعلیٰ ہے اور کون ادنیٰ؟ اس بات کا حقیقی علم تو فقط اللہ ہی کو ہے، عین ممکن ہے کہ جس کسی کو تم حقیر و کمتر سمجھتے ہوئے اس کا مذاق اڑا رہے ہو، اللہ کے نزدیک وہ تم سے افضل و بہتر ہو، اور اس کا مقام و رتبہ تم سے بڑھ کر ہو..... لہذا باہم ایک دوسرے کو تمسخر و تضحیک کا نشانہ نہ بناؤ، اور ایک دوسرے کی عزت اچھالنے سے باز رہو۔

اسی مذکورہ بالا آیت میں آگے مزید ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَرُوا بِاللِّقَابِ﴾ ترجمہ: (آپس میں ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کرو، اور باہم ایک دوسرے کو برے ناموں سے نہ پکارو)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِاللَّعَانِ، وَلَا الطَّعَّانِ، وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِئِ) (۱) ترجمہ: (مومن لعن طعن اور فحش و یہودہ گفتگو کرنے والا نہیں ہو سکتا) اس بارے میں مزید درج ذیل باتیں خوب سمجھنے اور ذہن نشیں کر لینے کی ضرورت ہے۔

☆..... انسان خطاء کا پتلا ہے، ہر انسان میں یقیناً کوئی نہ کوئی عیب تو ضرور ہوگا، ایسا انسان تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں کہ جس میں اخلاقی یا جسمانی کوئی بھی عیب یا نقص نہ ہو، یا جس سے زندگی بھر کبھی کوئی بھی خطاء یا لغزش سرزد نہ ہوئی ہو۔ ہر خطاء اور ہر عیب سے پاک تو فقط اللہ ہی کی ذات ہے۔ مثال مشہور ہے: مَنْ طَلَبَ أَخًا بِلا عَيْبٍ بَقِيَ بِلا أَخٍ یعنی اس دنیا میں جس کسی کو کسی ایسے بھائی کی تلاش ہو جس میں کوئی بھی عیب یا خامی نہ ہو، تو ایسا شخص یقیناً بغیر بھائی کے ہی رہ جائیگا۔ یعنی اتنی بڑی دنیا میں زندگی بھر کی تلاش و جستجو اور تگ و دو کے باوجود ایسا کوئی انسان نہیں مل سکے گا جو اخلاقی یا جسمانی ہر قسم کے عیوب و نقائص سے مکمل خالی اور پاک ہو۔

لہذا ہر انسان کی سوچ یہ ہونی چاہئے کہ اگر کسی شخص میں مجھے کوئی عیب نظر آتا ہے تو یقیناً خود مجھ میں بھی کوئی نہ کوئی عیب تو ہوگا، بلکہ شاید بہت سے عیوب ہوں، محاورہ مشہور ہے کہ: وَفِيكَ عِيُوبٌ وَلِلنَّاسِ أَعْيُنٌ یعنی عیوب و نقائص تو خود تم میں بھی موجود ہیں، اور دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی سلامت ہیں۔ لہذا دوسروں کے عیوب پر طعن و تشنیع، تمسخر و تضحیک، اور ان کی تشہیر کی بجائے اگر ہم ان کی پردہ پوشی کریں اور خاموشی اختیار کریں تو دوسرے بھی ہمارے عیوب پر خاموشی، پردہ پوشی اور درگزر کا رویہ اختیار کریں گے، اور اس طرح ہم خود بھی سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں گے..... اور دوسرے بھی چین کی زندگی



جی سکیں گے..... یوں معاشرے میں امن و امان اور سکون و اطمینان کی فضاء برقرار رہیگی۔ جبکہ اس کے برعکس اگر ہم نے دوسروں کے عیوب کی تشہیر کر کے انہیں اذیت پہنچائی، معاشرے میں، محلے اور برادری میں انہیں رسوا اور بدنام کیا، تو یقیناً وہ بھی ایسا ہی کوئی جوابی یا انتقامی اقدام کریں گے، تب زندگی اجیرن ہو جائیگی اور سکون و اطمینان غارت ہو جائیگا۔

☆..... اس بارے میں مزید ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں لگے رہنے اور پھر ان کی تشہیر اور معاشرے میں ان کی تحقیر و تذلیل کی بجائے انسان کی نظر ہمیشہ خود اپنے عیوب پر توجہ دینی چاہئے، اپنی اصلاح کی فکر اور کوشش کی جائے، اپنے انجام، اپنی قبر اور اپنی آخرت کو یاد کیا جائے، اللہ کی عدالت میں خود اپنے حساب و کتاب اور اپنے بارے میں جوابدہی کا احساس ذہن میں تازہ رہے اور ہمہ وقت یہی فکر دامن گیر رہے، دوسروں کی فکر چھوڑ دے۔

شاعر کہتا ہے:

الْمَرْءُ إِنْ كَانَ عَاقِلًا وَرِعًا      أَشْغَلَهُ عَنْ عُيُوبِ النَّاسِ وَرَعَهُ  
كَمَا السَّقِيمُ الْمَرِيضُ يُشْغِلُهُ      عَنْ وَجَعِ النَّاسِ كُلِّهِمْ وَجَعُهُ

یعنی: ”عقل مند اور پارسا انسان دوسروں کی عیب جوئی سے ہمیشہ باز رہتا ہے۔ جس طرح کسی درد میں مبتلا مریض اپنے درد کی وجہ سے دوسروں کے درد سے بے خبر رہتا ہے۔“

یعنی جس کسی کو خود اس کے اپنے مرض نے بد حال کر رکھا ہو اور اپنے درد نے تڑپا رکھا ہو..... اسے دوسروں کے درد کا ہوش کہاں ہوگا.....؟ شاعر کہتا ہے:

نتھی عیب کی جب ہمیں اپنی خبر      رہے ڈھونڈتے غیروں کے عیب و ہنر  
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر      تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

نیز کسی کا شعر ہے:

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ ہم نے کھولی  
خود اپنے دل میں ہم نے گنج عیوب دیکھا

☆..... نیز یہ بات بھی ذہنوں میں رہے کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان میں موجود کسی اخلاقی یا جسمانی عیب پر جو کوئی اسے طعنہ دیگا، وہ یہ بات یاد رکھے کہ آج یا کل، جلد یا بدیر، کبھی نہ کبھی ضرور وہ خود یا اس کے گھر کا کوئی فرد اسی عیب میں مبتلا ہو کر رہیگا۔ یہی قانون قدرت ہے، جو کہ اٹل ہے اور پتھر پر لکیر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِينَ وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ ، فَإِنَّهُ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ يَتَّبِعُ اللَّهُ عَوْرَتَهُ ، وَمَنْ يَتَّبِعِ اللَّهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ فِي بَيْتِهِ) (۱) ترجمہ: (مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور نہ ہی ان کے عیوب تلاش کیا کرو، کیونکہ جو کوئی ان کے عیوب تلاش کرے گا، اللہ اس کے عیوب تلاش کرے گا، اور اللہ جس کے عیوب تلاش کرے گا اسے اس کے گھر میں ہی رسوا کر کے ہی چھوڑیگا)

یعنی اللہ سے تو کسی کا کوئی عیب پوشیدہ نہیں ہے، لہذا مقصد یہ کہ دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں لگے رہنے والے انسان کے ساتھ اللہ کی طرف سے ”ستاری“ اور اس کی ”پردہ پوشی“ کی بجائے اس کی ذلت و رسوائی کے اسباب پیدا کر دیئے جائیں گے، خواہ وہ ذلت و رسوائی کے خوف سے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دے اور اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے، مگر اس کے

(۱) ابوداؤد [۳۸۸۰] ترمذی [۲۰۳۲] باب ماجاء فی تعظیم المؤمن۔ نیز: احمد [۱۹۷۹] [۱۹۸۱۶] [۲۲۲۵۵]

البتہ بعض روایات میں لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِينَ کی بجائے لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِينَ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ نیز بعض روایات میں وَلَا تَتَّبِعُوا کی بجائے وَلَا تَتَّبِعُوا (یعنی: ”اتباع“ کی بجائے: ”تتبع“) اسی طرح بعض روایات میں يَفْضَحْهُ فِي بَيْتِهِ کی بجائے يَفْضَحْهُ فِي جَوْفِ رَحْلِهِ کے الفاظ ہیں۔

باوجود وہ ذلیل و رسوا ہو کر رہی رہے گا۔

یہی قانونِ قدرت اخلاقی عیب کے علاوہ کسی جسمانی نقص یا عیب پر طنز و تمسخر کے سلسلہ میں بھی ذہن نشیں رہنا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (لَوْ سَخِرْتُ مِنْ كَلْبٍ لَخَشِيتُ أَنْ أَحُولَ كَلْبًا) (۲) یعنی: ”میں تو اس خوف سے کبھی کسی کتے کا بھی مذاق نہیں اڑاتا کہ کہیں مجھے بھی کتا ہی نہ بنا دیا جائے“۔

☆..... لہذا دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اس بارے میں اسلامی تعلیمات و ہدایات کی مکمل پیروی کرتے ہوئے دوسروں کی عیب جوئی، طعن و تشنیع اور تمسخر و تضحیک سے باز رہے، اور خود اپنے آپ پر نیز اپنے اہل و عیال پر رحم کرے۔ ورنہ قدرت کے بنائے ہوئے اس اہل قانون کے مطابق جلد یا بدیر یہی نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا کہ: ”جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے ضرور.....!“ اور تب حسرت و ندامت کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آ سکے گا اور وہ خود دنیا کے سامنے نشانِ عبرت بن کر رہ جائے گا.....!!!



## ”تکبر“ سے اجتناب

”تکبر“ اور ”غرور“ سے مراد ہے: ”خود کو دوسروں سے افضل، اعلیٰ و ارفع سمجھنا اور دوسروں کو اپنے مقابلہ میں کمتر، حقیر و ذلیل تصور کرنا، جس طرح ابلیس نے خود کو حضرت آدم علیہ السلام سے افضل و برتر سمجھتے ہوئے یوں کہا کہ: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ﴾ (۱) یعنی: ”میں تو اس سے بہتر ہوں“۔

”تکبر“ سے اجتناب کی ضرورت و اہمیت اس بات سے ہی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم میں ابلیس کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ (۲) ترجمہ: (اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا)

گویا تکبر و غرور شیطانی عمل ہے، لہذا مومن کیلئے بہر صورت اس سے مکمل اجتناب ضروری و لازمی ہے۔

نیز ”تکبر“ کی قباحت و شناعة درج ذیل آیات کی روشنی میں بھی ملاحظہ ہو:

ارشادِ ربانی ہے: ﴿سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۳) ترجمہ: (میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں)

نیز ارشاد ہے: ﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾ (۴) ترجمہ: (یقیناً وہ [اللہ] تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا)

(۱) الاعراف [۱۲] نیز: ص [۷۶] (۲) البقرة [۳۴] (۳) الاعراف [۳۶]

(۴) النحل [۲۳]

نیز ارشاد ہے: ﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُّتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (۱)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر مغرور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (۲)

ترجمہ: (کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے؟)

نیز ارشاد ہے: ﴿فَلْيَبْتَئْسَ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (پس کیا ہی برا ٹھکانہ

ہے تکبر کرنے والوں کا)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ

الْجِبَالَ طُُولًا﴾ (۴) ترجمہ: (اور زمین میں اکر کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے

اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے)

یعنی انسان تکبر اور فخر و غرور کی وجہ سے خواہ کتنا ہی اتر اکر اور اکر کر چلے، نیز اللہ کی بنائی ہوئی

زمین پر خوب زور زور سے پاؤں مار کر دیکھ لے، مگر یہ کہ وہ اپنے پاؤں سے یا اپنی مغرورانہ

چال سے زمین کو پھاڑ تو سکتا نہیں۔ اسی طرح خواہ وہ کتنا ہی تن کر، سراٹھا کر اور گردن لمبی

کر کے چل لے، مگر یہ کہ اللہ کے بنائے ہوئے پہاڑوں کے برابر لمبائی کو وہ نہیں پہنچ

سکتا..... تو پھر اس مغرورانہ چال سے کیا فائدہ.....؟

اور یہ تکبر محض مغرورانہ چال تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ انسان کی گفتگو، لب و لہجہ، رفتار و گفتار،

دوسروں کے ساتھ اس کے معاملات، اہل خانہ، عزیز و احباب، دوستوں اور ساتھیوں کے

ساتھ اٹھتے بیٹھتے اس کا رویہ و سلوک وغیرہ..... ان تمام امور میں کبر و غرور سے اجتناب

ضروری ہے۔

(۱) غافر مؤمن [۳۵] (۲) الزمر [۶۰] (۳) النحل [۲۹]

(۴) الاسراء بنی اسرائیل [۳۷]

اسی طرح ارشادِ بانی ہے: ﴿وَلَا تَصْعَرَ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْسِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَارٍ فَخُورٍ﴾ (۱) ترجمہ: (لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا (۲) اور زمین پر اتر کر نہ چل، کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو اللہ پسند نہیں فرماتا)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ (۳) ترجمہ: (اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر)

یعنی ایسی چال سے گریز کیا کیا جائے جس سے مال و دولت، جاہ و منصب، طاقت و قوت، حسن و جمال، یا اور کسی بھی وجہ سے دوسروں کے سامنے تکبر اور فخر و غرور کا اظہار ہوتا ہو۔ نیز اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان نہ تو بہت تیز چلے، اونہ ہی بہت سست رفتاری کا مظاہرہ کرے، بلکہ اپنی چال میں اعتدال پیدا کرے۔ کیونکہ بلا ضرورت تیز چلنا شرف اور وقار کے منافی ہے، جبکہ مؤمن کو ہر معاملہ میں ایسا رویہ اختیار کرنا چاہئے جو کہ شرف اور وقار کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ نیز بہت تیز چلنے میں گرجانے، خود اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو کوئی چوٹ لگ جانے یا تکلیف پہنچنے کا اندیشہ بھی ہے۔ اس کے برعکس بہت آہستہ چلنے میں بھی یہ قباحت ہے کہ اس طرح دوسرے راہ گیروں کیلئے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ نیز بلا وجہ سست رفتاری میں بیماروں اور معذوروں کے ساتھ مشابہت بھی ہے، لہذا جب اللہ نے صحت و تندرستی جیسی انمول اور گراں قدر نعمت سے نوازا ہو تو بلا وجہ بیماروں اور معذوروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا یقیناً بہت بڑی ناشکری ہے۔

نیز بہت آہستہ چلنے میں مغروروں اور متکبروں کے ساتھ مشابہت بھی ہے، کیونکہ اکثر مغرور

(۱) لقمان [۱۸] (۲) یعنی جب کوئی دوسرا تم سے ہمکلام ہو تو تکبر اور غرور کی وجہ سے اس سے اپنا منہ نہ پھیرو۔

(۳) لقمان [۱۹]

و متکبر قسم کے لوگ بھی اکڑ کر اور اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہیں، گویا کہ گن گن کر قدم رکھ رہے ہوں، اس طرح تکبر و تصنع کے ذریعہ وہ دوسروں پر اپنا امتیاز جتانا چاہتے ہیں۔  
متکبر انسان کو یہ قانونِ قدرت ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ تکبر و غرور، خود پسندی، اور خود نمائی کا یقینی انجام دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی ہے۔

ایک حدیثِ قدسی میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں:  
(الْكِبْرِيَاءُ رِدْآئِي، وَالْعِظْمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا، أَلْقَيْتُهُ فِي جَهَنَّمَ) (۱) ترجمہ: (بڑائی میری چادر ہے، اور عظمت میری ازار ہے، جو شخص مجھ سے ان کو چھیننا چاہے گا، میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا) یعنی ”عظمت و کبریائی“، محض اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، لہذا جو کوئی اس صفت کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ اپنے لئے خود جہنم کا سامان کرے گا۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ) (۲) ترجمہ: (وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر و غرور ہو)

☆..... ”کبر و غرور“ کے برعکس اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی کی خاطر تواضع اور عجز و انکسار کو اپنا شیوہ و شعار بنانے والوں کیلئے قرآن و حدیث میں اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے جنت کی خوشخبری اور دنیا و آخرت میں کامیابی، اور عزت و رفعت کی نوید سنائی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں قارون کی سرکشی، تکبر اور طغیان کے نتیجہ میں ہلاکت و بربادی کے تذکرہ کے بعد تواضع و انکسار کا راستہ اختیار کرنے والوں کیلئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف

(۱) ابن ماجہ [۴۱۷۴] [۴۱۷۵] ابن حبان [۵۶۷۱] احمد [۷۳۷۶] وغیرہ

(۲) مسلم [۹۱] باب تحریم الکبر۔

سے انعام آخرت کی کامیابی اور عمدہ انجام کا تذکرہ و بیان ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فُسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (آخرت کا یہ بھلا گھر ہم انہی کیلئے مقرر کر دیتے ہیں جو زمین میں اونچائی، بڑائی اور فخر نہیں کرتے، نہ ہی فساد کی چاہت رکھتے ہیں، اور آخرت کی بھلائی تو پرہیزگاروں کیلئے ہے)

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ کے خاص بندوں کی صفات و علامات کے تذکرہ و بیان کے ضمن میں ایک یہ صفت بھی مذکور ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲) ترجمہ: (رحمن کے [پچے] بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں)

نیز قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی ﷺ کو مومنین کے ساتھ ہمیشہ نرمی سے پیش آنے اور تواضع و انکسار اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (آپ ان لوگوں کے ساتھ فروتنی سے پیش آئیے جو مسلمانوں میں شامل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ) (۴) ترجمہ: (جب کوئی بندہ [کسی سے انتقام کی بجائے اسے] معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ و ترقی عطا فرماتے ہیں، نیز جو کوئی اللہ کی رضامندی کیلئے تواضع و انکسار اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مزید رفعت و بلندی عطاء فرماتے ہیں)۔

(۱) القصص [۸۳] (۲) الفرقان [۲۳] (۳) الشعراء [۲۱۵]

(۴) مسلم [۲۵۸۸] باب استحباب العفو والتواضع۔



نیز ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لَا يَفْخَرَأَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِي أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ) (۱) ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی ہے کہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ تواضع سے پیش آیا کرو، کوئی کسی کے سامنے فخر و غرور کا مظاہرہ نہ کرے، اور نہ ہی کوئی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرے)

☆..... یہاں یہ بات بھی ذہنوں میں رہنی چاہئے کہ کبر و غرور، فخر و مباہات، خود پسندی و خود نمائی، اور حُبِ جاہ جیسی مکروہ و مذموم ترین صفت و عادت محض فساق و فجار یا دنیا کے طلبگاروں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات بہت سے اصحابِ علم و فضل اور عابد و زاہد قسم کے لوگ بھی شیطان کی اس شاطرانہ چال اور اس کے بچھائے ہوئے اس دلفریب و خوشنما جال میں پھنس کر اپنی تمام تر متاع سے محروم ہو جاتے ہیں اور اپنی محنت و ریاضت برباد کر بیٹھتے ہیں۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے زاہد کو کہ بندا گانِ خدا پر زباں دراز کرے  
اس قسم کے عباد و زہاد کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جو معاملہ ہو اور ان کیلئے جو فیصلہ ہو، وہ تو ایک الگ اور مستقل پریشانی کا سبب ہے ہی، اس کے علاوہ مزید یہ کہ وہ خلقِ خدا کی نظروں سے بھی گر جاتے ہیں اور جگ ہنسائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

اس کی مزید تفصیل اس طرح سمجھ لینی چاہئے کہ انسانوں کی دراصل دو قسمیں ہیں: دنیا کے طلبگار اور دین کے طلبگار۔ دنیا کے طلبگاروں کو تو شیطان مال و زر کی ہوس، نیز نفسانی و جسمانی خواہشات میں مشغول و منہمک رہنے کا حکم دیتا ہے۔ جبکہ دین کے طلبگاروں کی بربادی کیلئے وہ حُبِ جاہ، کبر و غرور یا کاری، خود پسندی و خود نمائی جیسے ہتھکنڈے استعمال

کرتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات کسی شخص کے علم و فضل اور تقویٰ و زہد کی وجہ سے لوگ اسے انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کیلئے دیدہ و دل فرس راہ کئے رکھتے ہیں۔ لیکن اس تقویٰ و زہد نیز عزت اور قدر و منزلت ہی کے ذریعہ شیطان اس کی رسوائی و بربادی کا انتظام اس طرح کرتا ہے کہ اس کے دل میں کبر و غرور خود پسندی، ریاء اور حبِ جاہ جیسے مذموم و مکروہ جذبات ڈال دیتا ہے، اور پھر یہی چیز اس کیلئے بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ مزید یہ کہ اس قسم کا انسان بعض اوقات اپنی اس قدر و منزلت پر اللہ کی شکر گزاری اور عجز و انکسار کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مزید قدر و منزلت کی ہوس میں کوئی ایسی بات یا ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی تمام تر عزت یکسر خاک میں مل جاتی ہے اور اسے خفت اور ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

☆..... نیز اس کی مثال اس طرح بھی بیان کی جاسکتی ہے کہ فرض کیجئے کہ کسی ادارے میں متعدد ملازمین کام کرتے ہوں، ان میں سے کچھ افراد ایسے ہوں کہ جن کی مہارت و قابلیت اور کارکردگی کا معیار بہت اعلیٰ نہ ہو، بس گزاری لائق ہو، البتہ مجموعی طور پر متعلقہ افسران بالا ان سے مطمئن ہوں..... جبکہ اسی ادارے میں کوئی بہت ہی لائق و فائق انسان بھی موجود ہو جس کی کارکردگی باقی تمام افراد کے مقابلہ میں نہایت ہی عمدہ و اعلیٰ ہو، اور ہر طرف اس کی شہرت اور بڑی قدر و منزلت ہو، نیز یہ شخص اٹھتے بیٹھتے ہر موقع پر ہمیشہ افسران بالا کے سامنے اپنی قابلیت و مہارت اور حسن کارکردگی کی داستانیں بیان کر کے ان سے خوب داد و تحسین بھی وصول کرتا رہتا ہو اور ان کا محبوب و مقرب اور نورِ نظر بنا ہوا ہو..... مگر اس قدر و منزلت، عزت افزائی اور آفرین و داد و تحسین پر اللہ کا شکر ادا کرنے اور بس اپنے کام سے کام رکھنے کی بجائے یہ شخص ہمیشہ افسران بالا کے سامنے اپنے دوسرے ساتھیوں کے پست

معیار کی خوب تشہیر بھی کرتا چلا جاتا ہوا اور ان کی تحقیر و تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا ہو..... اس کی اس حرکت کی وجہ سے یقیناً نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ رفتہ رفتہ اس کے افسران بالا اس کی اس مکروہ عادت اور مذموم خصلت کی وجہ سے اس سے بیزار بلکہ متنفر ہو جائیں گے، اور پھر صورتِ حال یکسر تبدیل ہو جائے گی، یہ شخص اپنی تمام تر مہارت، صلاحیت، اور قابلیت و لیاقت، نیز محنت و جاں فشانی اور حسنِ کارکردگی کے باوجود مکروہ اور ناپسندیدہ قرار پائیگا، اور ہر کوئی اس سے کنارہ کشی اور گلو خلاصی کی کوشش کریگا۔ جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نسبتاً اپنے پست معیار کے باوجود پسندیدہ قرار دیئے جائیں گے..... کسی نے درست کہا ہے کہ: ”غرور کا سر نیچا“۔

☆..... کبر و غرور، خود پسندی، خود نمائی، جھوٹی عزت اور سستی شہرت کی طلب، نیز حُبِ جاہ وغیرہ کی مذمت میں گذشتہ سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اگرچہ ہر مہذب و مثقف انسان ان تمام باتوں کا مکمل علم و ادراک اور اس بارے میں خوب آگاہی و شعور اور واقفیت و معرفت رکھتا ہے، اور بچپن سے ہی اس قسم کی باتیں درسی و غیر درسی کتب میں بکثرت اس کی نظر سے گذرتی رہتی ہیں اور سماعت سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ انسان اکثر و بیشتر ان باتوں سے غافل رہتا ہے، اور جب کبھی وہ اپنے علم و فضل اور مقام و مرتبہ کے باوجود خود پسندی کے جذبہ سے مجبور ہو کر ایسی کوئی نامناسب حرکت کر بیٹھتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے ذلت و خفت اٹھانا پڑتی ہے تب اسے بچپن میں پڑھی ہوئی وہ تمام باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ لیکن ”اب پچھتاوے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت.....“ لہذا دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان باتوں کو گاہے بگاہے پڑھتا اور سوچتا رہا کرے اور اس چیز کو اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کر لے۔

## ”غصہ“؛ دین و دنیا کا خسارہ:

قرآن کریم میں اہل ایمان کی علامات و صفات کے تذکرہ و بیان کے ضمن میں ارشاد ہے:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۱)

ترجمہ: (وہ غصہ پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان نیک کاروں سے محبت فرماتا ہے)

نیز ارشادِ باری ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور وہ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور غصے کے وقت [بھی] معاف کر دیتے ہیں)

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور گزارش کی کہ: اے اللہ کے رسول! مجھے کچھ وصیت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: (لَا تَغْضَبْ) یعنی: ”غصہ نہ کیا کرو“۔ اس شخص نے متعدد بار اپنی یہی گزارش دہرائی، اور ہر بار رسول اللہ ﷺ نے اسے یہی وصیت فرمائی۔ (۳)

اس حدیث کی روشنی میں ”غصہ“ کی قباح و شناعیت، نیز انسان کیلئے اس سے اجتناب کی ضرورت و اہمیت واضح و ثابت ہوتی ہے۔

☆..... حقیقت یہ ہے کہ غصہ انسان کی عقل کا، نیز اس کی صحت کا دشمن ہے، کیونکہ:

☆..... زیادہ غصہ دکھانے والا انسان خطرناک اور مہلک قسم کے جسمانی، نفسیاتی، ذہنی، اور اخلاقی و روحانی امراض و آفات کا شکار ہو کر جلد ہی راجحی ملکِ عدم ہو جاتا ہے۔

☆..... زیادہ غصہ دکھانے والا انسان خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی خانہ بربادی کا سامان کرتا ہے، کیونکہ اس کے اس غصیلے اور درشت مزاج کی وجہ سے گھر میں آئے دن تلخ کلامی اور نوک جھونک ہوتی رہتی ہے، جس کے نتیجے میں اکثر و بیشتر طلاق تک نوبت جا پہنچتی ہے اور پھر اس کا گھر برباد اور اس کے بچے در بدر ہو جاتے ہیں۔

☆..... غصہ دکھانے والا انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، کبھی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا، کبھی کوئی اعلیٰ مقام و رتبہ حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ جب وہ روز روز غصہ دکھائیگا تو ملازمت سے برطرف کر دیا جائیگا۔ مثال مشہور ہے: لَا يَنَالُ الْعُلَا مَنْ طَبَعُهُ الْغَضَبُ یعنی زیادہ غصہ دکھانے والا انسان کبھی کسی بلند مقام و مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔

☆..... غصہ دکھانے والا انسان کبھی کامیاب تاجر نہیں بن سکتا، کیونکہ اس کے ہر روز کے اس غصے اور تلخ کلامی و درشت روی کی وجہ سے گاہکوں کے ساتھ اس کے تعلقات متاثر و مجروح ہوں گے جس کی وجہ سے اس کے کاروبار پر بھی یقیناً منفی و ناخوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔

☆..... غصہ دکھانے والا انسان جب جوش میں ہوش کھو بیٹھتا ہے تو جائز و ناجائز، حلال و حرام اور خیر و شر کی تمیز و تفریق کو بھلا کر ایسی ناپسندیدہ، نامناسب، نامعقول، غیر مہذب اور غیر شائستہ حرکتوں اور کارروائیوں میں مبتلا و مشغول ہو جاتا ہے جو اس کیلئے دینی و دنیاوی خسارے، تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کا سبب بنتی ہیں۔

☆..... لہذا یہ غصہ انسان کی صحت کا دشمن، اس کی عقل کا دشمن، اس کے دین کا دشمن، اس کی دنیا کا دشمن، اور اس کی آخرت کا دشمن ہے، نیز اس میں انسان کیلئے دونوں جہانوں میں سراسر خسارے اور نقصان ہی کا سامان و انتظام ہے۔

مثال مشہور ہے کہ: ”غصے کی ابتداء ہمیشہ حماقت سے اور انتہاء ہمیشہ ندامت پر ہوتی ہے“۔  
☆..... ”غصے“ کے انہی لامحدود دینی و دنیاوی مفاسد و نقصانات کی وجہ سے قرآن و حدیث میں اس سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں صبر و تحمل، بردباری، ضبط نفس، عفو و درگزر، رواداری و وسعت قلبی اور احترامِ انسانیت جیسی اعلیٰ صفات و عادات کو اپنانے کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ (۱) ترجمہ: (جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کر لے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (۲) ترجمہ: (اور جو کوئی صبر کر لے اور معاف کر دے، یقیناً یہ تو بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ (۳) ترجمہ: (برائی کو بھلائی سے دفع کرو، پھر وہی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہو جائیگا جیسے دلی دوست)

یعنی انتقام کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے اگر برائی کا بدلہ اچھائی اور احسان کے ساتھ دیا جائے تو اس کی برکت سے باہمی نفرتوں اور بغض و عداوت، نیز اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام مشکلات و آفات، بے سکونی، ذہنی کوفت اور اعصابی تناؤ وغیرہ سے نجات نصیب ہو جائیگی، اور صرف یہی نہیں، بلکہ وہ شخص جو کل تک بدترین دشمن اور قتل و غارت گری و خوں ریزی پر آمادہ تھا، آج وہ بہترین دوست بلکہ مددگار بن جائیگا، یہ اللہ کی طرف سے وعدہ ہے

البتہ جذبہ صادق، یقین کامل اور خلوص دل کے ساتھ آزمائش شرط ہے.....!

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَا زَاَدَ اللَّهُ عَبْدًا بِغَفْوٍ إِلَّا عِزًّا) (۱)

ترجمہ: (جب کوئی بندہ [کسی سے انتقام کی بجائے اسے] معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں ترقی و اضافہ عطا فرماتے ہیں)

اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ ہے: (لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرْعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ) (۲) ترجمہ: (وہ شخص طاقتور نہیں جو اپنے مقابل کو پچھاڑ دے، طاقتور تو دراصل وہ ہے جو غصے کے وقت خود اپنے آپ کو قابو میں رکھے)

### ☆ احتیاطی تدابیر:

غصے کی اس قدر قباح و شناعیت، اس کے دینی و دنیاوی مفاسد و نقصانات، نیز اس کے تباہ کن نتائج و اثرات کے تذکرہ و بیان کے بعد اب یہ بات غور طلب ہے کہ اس آفت و مصیبت سے حفاظت و نجات کیلئے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں؟  
اس سلسلے میں یقیناً اسلامی تعلیمات و ہدایات موجود ہیں، جن کی روشنی میں درج ذیل باتیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے:

(۱)..... انسان کو جب غصہ آنے لگے تو اسے یہ بات سوچنی چاہئے کہ اللہ نے انسان کو کتنی اچھی شکل و صورت سے نوازا ہے، لیکن اسے جب غصہ آتا ہے تو اس کی شکل کس قدر بگڑ جاتی ہے، گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں، آنکھیں باہر کو اُٹھ آتی ہیں، سانس اکھڑنے لگتی ہے، ہوش و حواس غائب ہو جاتے ہیں، منہ سے مغلظات اور غیر مہذب و ناشائستہ کلمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے..... لہذا انسان کو اس بارے میں غور کرنا چاہئے کہ ابھی تک تو میری

شکل اچھی خاصی ہے، حاضرین محفل میں میری عزت بھی ہے، لیکن اب اگر میں غصہ دکھاؤں گا تو میری یہ اچھی خاصی شکل بگڑ جائیگی، لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو جائیگا، اور میں ان سب کے سامنے ایک تماشا بن کر رہ جاؤں گا.....! لہذا میں خود اپنے ہی ہاتھوں خود کو دنیا کے سامنے تماشا کیوں بناؤں.....؟

(۲)..... یہ بات ہمیشہ ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ اور بے موقع ہنسی مذاق میں اکثر و بیشتر کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے جو کسی کو ناگوار گذرتی ہے، اور پھر وہ بات غصے اور تلخی و رنجش کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ لہذا فضول اور بے موقع ہنسی مذاق سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔

(۳)..... غصے کا اصل سبب اور محرک عموماً تکبر اور غرور ہوا کرتا ہے۔ انسان جب خود کو بڑا اور افضل، اور دوسروں کو حقیر و کمتر سمجھتا ہے تبھی بات بات پر وہ دوسروں پر برستا اور بگڑتا ہے اور ہمیشہ غصہ دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کے غصے کے عین جوش اور عروج کے موقع پر اسے کسی ایسے انسان کے رو برو لاکھڑا کیا جائے جو مقام و مرتبے یا شان و شوکت میں اس سے بڑھ کر ہو، تو اس کا سارا غصہ فوراً ہی غائب ہو جائیگا.....! لہذا انسان کو اپنی عام زندگی اور روزمرہ کے معاملات میں تکبر و غرور جیسی شیطانی صفت سے بچنا چاہئے اور اس کے برعکس خوش اخلاقی، تواضع، عجز و انکسار جیسی عمدہ عادات و صفات اور اعلیٰ اخلاق کو اپنانا چاہئے۔ تاکہ اس کی بدولت وہ غصے جیسی مکروہ و تباہ کن عادت سے محفوظ و مامون رہ سکے۔

(۴)..... انسان کو جب اپنی طبیعت میں غصے کے برے اثرات محسوس ہونے لگیں تو اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عظمت و قدرت، اس کے قہر و غضب اور اس کی شانِ جباری و قہاری..... نیز اس کے مقابلے میں اپنی کمزوری و ناتوانی کا اپنے ذہن میں خوب استحضار و استدراک



کرنا چاہئے۔

(۵)..... جب کسی پر غصہ آئے تو مار پیٹ یا جذبہ انتقام کے ہاتھوں مغلوب ہونے کی بجائے رحمت و ہمدردی، اور غنودرگزر جیسی عمدہ عادات و صفات کی طرف راغب ہونا چاہئے، اور اس موقع پر اس کا اندازِ فکر یہ ہونا چاہئے کہ اگر یہ شخص میرا مجرم اور قصور وار ہے تو میں خود بھی تو اللہ کا مجرم اور قصور وار ہوں، کیونکہ مجھ سے بھی تو یقیناً کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی گناہ تو ضرور سرزد ہوا ہوگا، کیونکہ تمام گناہوں اور خطاؤں سے پاک تو کوئی بھی نہیں ہے..... لہذا اپنے مجرم اور گناہگار کو یہ سوچ کر معاف کر دینا چاہئے کہ شاید اس طرح اللہ بھی مجھے معاف فرمادے.....!!

ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا، أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ: (معاف کر دینا اور درگزر کر لینا چاہئے، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف فرمادے؟ اللہ تو قصوروں کو معاف فرمانے والا مہربان ہے) یعنی اگر ہم اپنے لئے اللہ سے معافی کے خواہشمند اور مغفرت کے طلبگار ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم بھی دوسروں پر بگڑنے، برسنے اور غصہ دکھانے کی بجائے انہیں معاف کر دیا کریں۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: (يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَاذَا يُبَاعِدُنِي مِنْ غَضَبِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ؟) یعنی: ”اے اللہ کے رسول! میں اللہ کے غصے سے بچنے کیلئے کیا طریقہ اختیار کروں؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: (لَا تَغْضَبْ) یعنی: ”دوسروں پر غصہ نہ کیا کرو“۔ (۲)

مقصد یہ کہ جو کوئی دوسروں کے سامنے بلا وجہ غصہ دکھانے سے باز رہے گا، اللہ کے غضب

اور غصے سے بھی وہی محفوظ و سلامت رہے گا۔

نیز ارشادِ نبویؐ ہے: اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمَكُم مِّنْ فِي السَّمَاءِ (۱)  
ترجمہ: (تم زمیں والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا)  
شاعر کہتا ہے:

کرد مہربانی تم اہلِ زمیں پر خدا مہربان ہوگا عرشِ بریں پر

(۶)..... غصے کے وقت انسان کو کچھ بولنے کی بجائے مکمل خاموشی اختیار کر لینی چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ) (۲)

ترجمہ: (تم میں سے کسی کو جب غصہ آئے تو وہ خاموش رہے)

کیونکہ غصے کی شدت اور حدت کے وقت جب انسان مجبوظ الحواس ہو جاتا ہے اور اپنی زبان سے ہرزہ سرائی کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے، ایسے میں عین ممکن ہے کہ کسی بھی لمحے اس کی زبان سے کوئی ایسی بیہودہ، نامناسب اور خطرناک قسم کی بات نکل جائے کہ جس کے برے اثرات بہت دور رس ہوں اور اس کے نتائج نہایت تباہ کن ہوں..... اور پھر صورتِ حال ایسا رخ اختیار کر لے کہ جو: ”لحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی ہے“ کا مصداق بن جائے.....

لہذا رسول اللہ ﷺ کی اس نصیحت و ہدایت پر عمل پیرا رہتے ہوئے غصے کے وقت حتیٰ الامکان خاموشی اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۷)..... غصے کے وقت انسان کے خون میں نیز اس کے مزاج میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، ایسے میں جس قدر حرکت زیادہ ہوگی اسی قدر یہ حرارت بھی بڑھتی جائیگی.....

کیونکہ حرکت کی وجہ سے حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہذا غصے کے وقت انسان کو چاہئے کہ حرکت سے مکمل اجتناب کرے، اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ، فَإِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَالْأَلْفَ لِيُضْطَجِعْ) (۱) ترجمہ: (تم میں سے کسی کو جب غصہ آئے، اگر وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اگر تب بھی غصہ ختم نہ ہو تو لیٹ جائے)

نیز یہ کہ غصے کی حالت میں آرام و سکون سے ایک جگہ بیٹھے رہنے کی بجائے انسان اگر کھڑا ہوگا تو پھر شاید فریقین باہم تلخ کلامی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دیں، جس کے نتیجے میں شاید وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب پہنچ جائیں کہ تلخ کلامی سے بڑھ کر نوبت دست درازی تک پہنچ جائے، اور پھر باہم دست و گریباں بھی ہو جائیں..... اس کے بعد نہ جانے نوبت کہاں تک جا پہنچے اور کیا مصیبت برپا ہو جائے.....؟

(۸)..... غصے کے وقت انسان کے خون نیز اس کے جسم اور مزاج میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، اور حرارت آگ کی خاصیت ہے۔ شیطان بھی آگ ہی سے بنا ہوا ہے۔ لہذا غصے کے وقت انسان پر شیطانی اثرات غالب آ جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس سے ایسی مذموم اور نازیبا قسم کی حرکتیں صادر ہوتی ہیں اور وہ اس قدر درندگی و سفاکی کا مظاہرہ اور ایسے ہولناک اور وحشیانہ جرائم کا ارتکاب کر گزرتا ہے کہ جن کا وہ اپنی عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا..... لہذا ان شیطانی اثرات سے محفوظ رہنے کیلئے غصے کے وقت شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کی جائے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو کہ باہم لڑائی جھگڑے میں مشغول تھے، ان میں سے ایک کا غصے کی شدت کی وجہ سے برا حال تھا، آپ ﷺ نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا: (إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا ذَهَبَ عَنْهُ الشَّيْطَانُ) یعنی: ”میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر اس وقت یہ شخص وہ کلمہ پڑھ لے تو اسے شیطان سے نجات نصیب ہو جائیگی۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کلمہ:

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ہے۔ (۱)

(۹)..... نیز غصے کے وقت چونکہ انسان کے مزاج میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ آگ کی خاصیت ہے، اور شیطان بھی آگ ہی سے بنا ہوا ہے، آگ کو بجھانے کیلئے پانی استعمال کیا جاتا ہے، لہذا شیطانی اثر کی اس آگ کو بجھانے کیلئے وضوء کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ، وَإِنَّمَا تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ، فَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ) (۲) ترجمہ: (غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے، لہذا تم میں سے کسی کو جب غصہ آئے تو وضوء کر لیا کرے)۔



## ”صبر“؛ دنیا و آخرت میں کامیابی کا راز:

انسان کیلئے دونوں جہانوں میں صدموں اور پریشانیوں سے نجات اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونے کیلئے ”صبر“ کی عادت اپنانا انتہائی ضروری ہے۔ مثال مشہور ہے: مَنْ صَبَرَ ظَفَرَ یعنی: کامیابی تو بس اسی کو نصیب ہوئی جس نے صبر کیا۔

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (یقیناً اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) لہذا قابل غور بات ہے کہ جس کسی کو اللہ کی معیت نصیب ہو جائے تو یقیناً اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے.....؟

نیز ارشادِ باری ہے: ﴿إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۲) ترجمہ: (بے شک صبر کرنے والوں کو ہی ان کا پورا پورا بے شمار اجر دیا جاتا ہے)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ.....﴾ (۳) ترجمہ: (اور وہ اپنے رب کی رضا مندی کی طلب کیلئے صبر کرتے ہیں، اور نمازوں کو برابر قائم رکھتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اسے چھپے کھلے خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھی بھلائی سے ٹالتے ہیں، انہی کیلئے عاقبت کا گھر ہے.....)

## ☆ صبر کی اقسام:

اہل علم نے صبر کی چند اقسام بیان کی ہیں، جن کا مختصر تذکرہ کچھ اس طرح ہے:

### (۱) صبر علی الطاعة:

یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور تمام اسلامی احکام و تعلیمات پر عمل کے معاملہ میں سستی و تغافل یا پس ہمتی کی بجائے مکمل اہتمام و التزام اور صبر و ثبات سے کام لینا۔

☆..... مثلاً روزانہ پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی کے بارے میں اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ یقیناً یہ انتہائی کٹھن اور دشوار کام ہے (۱) زندگی بھر ہر روز پانچ بار وضوء کرنا، کبھی اپنی نیند اور آرام کو قربان کرنا، کبھی تجارت، دکانداری یا دفتر کو چھوڑنا، کبھی یاروں دوستوں کی محفل جمی ہو یا کوئی کھیل کود یا دلچسپی کا کوئی اور مشغلہ عروج پر ہو، ایسے میں ”اللہ اکبر“ کی صدا سنتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور دنیا کے تمام مشغلوں اور دلچسپیوں سے منہ موڑ کر چپ چاپ مسجد کی طرف چل دینا..... راستے میں گرمی ہو یا سردی، تپتی ہوئی دھوپ ہو یا طوفان اور آندھی، اندھیرا ہو یا روشنی..... ہر صورت میں مسجد کی طرف اپنا یہ سفر زندگی بھر صبح و شام دن کے اجالوں میں اور رات کے اندھیروں میں اسی طرح جاری و ساری رکھنا..... یقیناً اس کیلئے ”صبر“ ناگزیر ہے۔

☆..... اسی طرح زندگی بھر ہر سال رمضان کے مہینے میں صبح سے شام تک مسلسل بھوکا پیاسا رہنا ”صبر“ کے بغیر ممکن نہیں۔

☆..... حج کے موقع پر اپنے وطن اور گھر سے دوری، عزیز و احباب سے جدائی، سفر کی صعوبت و مشقت، راحت و آرام نیز روپے پیسے کی قربانی..... اور پھر وہاں مناسک کی ادائیگی کے دوران قدم قدم پر تکلیفوں، مشقتوں اور خلاف مزاج باتوں کو خندہ پیشانی سے

(۱) جیسا کہ نماز کے بارے میں خود ارشاد باری ہے: ﴿وَأَنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ.....﴾

[البقرہ: ۴۶] یعنی: (یہ چیز شاق ہے مگر [اللہ کا] ڈر رکھنے والوں پر.....)

برداشت کرنا..... یقیناً یہ سب کچھ ”صبر“ کے بغیر ممکن نہیں۔

☆..... اسی طرح زندگی بھر ہر سال ”زکوٰۃ“ کی ادائیگی، اپنی محنت و جاں فشانی اور خون پسینی کی کمائی کسی جبر یا زیادتی کے بغیر خالصہً برضا و رغبت، چپ چاپ اور خاموشی کے ساتھ کسی مسکین کے حوالے کر دینا..... یقیناً اس کیلئے بہت بڑی ثابت قدمی اور ”صبر“ کی ضرورت ہے۔

## (۲) صبر عن المعصیۃ:

یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نافرمانی اور تمام معاصی و منکرات کی آلودگی سے اپنا دامن بچائے رکھنے کی خاطر ”صبر و ثبات“ کا مظاہرہ کرنا۔ خصوصاً دورِ حاضر میں جبکہ قدم قدم پر فحاشی و منکرات کا ایک سیلاب ہے، طاغوتی قوتوں نے انسان کو راہِ حق سے گمراہ و برگشتہ کرنے کیلئے قدم قدم پر خوشنما جال پھیلا رکھے ہیں..... حلال آمدنی کے ذرائع محدود و مسدود جبکہ حرام مال ہر طرف سے خود بخود اُٹھتا چلا آ رہا ہے.....! ایسے میں مالِ حرام کی اس دلدل سے خصوصاً، نیز دیگر تمام معاصی و منکرات کی آلودگیوں سے عموماً اپنا دامن بچائے رکھنا یقیناً انتہائی ”صبر آزما“ کام ہے۔

## (۳) اللہ کی بنائی ہوئی ”تقدیر“ پر صبر:

یعنی زندگی کے اس سفر میں پیش آنے والے مختلف تکلیف دہ حالات اور پریشان کن امور پر ”صبر“ سے کام لینا، اور یہ سوچ رکھنا کہ تقدیر میں لکھی ہوئی پریشانیوں سے تو کسی صورت فرار ممکن نہیں، اور ”تقدیر“ بنانے والا اللہ ہے۔ لہذا ان پریشانیوں میں بھی یقیناً اللہ کے علم میں بندے کیلئے کوئی حکمت و مصلحت ہی ہوگی جسے وہی بہتر جانتا ہے، ہم نہیں جانتے، کیونکہ اللہ کا علم کامل ہے اور ہمارا علم ناقص ہے۔

معاشرتی آداب و اخلاق (۱۷۵) ”صبر“ دنیا و آخرت میں کامیابی کا راز

☆..... یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مومن کو ہمیشہ اللہ سے عافیت و سلامتی ہی طلب کرتے رہنا چاہئے اور یہ دعاء ہونی چاہئے کہ اللہ اسے ہر قسم کے ابتلاء اور آزمائش سے محفوظ و مامون ہی رکھے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی آزمائش پیش آ ہی جائے تو اسے اللہ کی مرضی و تقدیر سمجھ کر صبر و ثبات سے کام لینا چاہئے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ الْأُمُورِ﴾ (۱)  
ترجمہ: (اور جو مصیبت تم پر آجائے اس پر صبر کرنا، یقیناً یہ بہت ہی تاکید کی کاموں میں سے ہے)

یعنی تکلیفوں اور مصیبتوں پر صبر کرنا بہت ہی بڑا اور اہم ترین کام ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص تاکید کی گئی ہے۔

☆..... دوسری بات یہ کہ انسان کو ہمیشہ اس بارے میں غور و فکر کرنا چاہئے کہ اللہ کی طرف سے ابتلائیات اور آزمائشوں کا سلسلہ تو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ بھی جاری رہا۔

خود رسول اللہ ﷺ افضل الخلق اور سید الانبیاء والمرسلین ہونے کے باوجود پیدائشی یتیم تھے، زندگی بھر آنکھیں باپ کی صورت دیکھنے کو ترستی رہیں، اس کے بعد محض چھ برس کی عمر میں انسانی آبادی سے دور ویران و بیابان مقام پر پہاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان اپنی معصوم نگاہوں سے ماں کو اس فانی دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوتے دیکھا۔ آپ کی چار صاحبزادیوں میں سے تین کی وفات عین جوانی کی عمر میں آپ کی حیات میں ہی ہو گئی۔ آپ کی عمر مبارک جب اکٹھ برس ہوئی تب صاحبزادے ابراہیم کی ولادت ہوئی، لیکن یہ

(۱) لقمان [۱۷]



صاحبزادہ جب اٹھارہ ماہ کی عمر کو پہنچا اور اس کی معصوم مسکراہٹوں سے گھر کے آنگن میں بہار آنے لگی، تب آپ کے اس معصوم لختِ جگر اور نورِ نظر نے ایک روز خود آپ کی گود مبارک میں ہی آخری ہنسی کی اور ہمیشہ کیلئے داغِ مفارقت دے گیا، اور یہ منظر دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے..... اس کے علاوہ کفار و مشرکین، نیز یہود و منافقین کی طرف سے مسلسل جسمانی و ذہنی تکلیفوں اور ایذا رسانیوں کا سلسلہ بھی ہمیشہ ہی جاری رہا۔ کبھی پتھر برساکر لہو لہان کیا گیا، کبھی جنگیں مسلط کی گئیں، کبھی دیوانہ، کبھی جادوگر کہا گیا، کبھی کھانے میں زہر ملایا گیا..... حتیٰ کہ خالصہ گھریلو عزت و شرف کو بھی مجروح و اعدا کرنے کی ناپاک جسارت اور گھناؤنی سازش کی گئی..... مگر آپ ہمیشہ ہی ”صبر و تحمل“ کا پیکر بنے رہے۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی اس سیرتِ طیبہ میں اہل ایمان کیلئے خصوصاً اور تمام عالمِ انسانیت کیلئے عموماً ”اسوۂ حسنہ“ ہے،

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ذہن نشین رہنا چاہئے: (عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءٌ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءٌ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ) (۱) ترجمہ: (مؤمن کا معاملہ تو بہت ہی عجیب ہے، کیونکہ اس کیلئے تو ہر صورت میں خیر ہی خیر ہے اور یہ تو صرف مؤمن ہی کی شان ہے) [کسی اور کو یہ نعمت نصیب نہیں] کیونکہ اگر اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، یوں وہ خوشی اس کیلئے خیر بن جاتی ہے، اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر سے کام لیتا ہے، اور اس طرح وہ تکلیف بھی اس کیلئے خیر بن جاتی ہے) (۲)

(۱) مسلم [۲۹۹۹] باب لا یتلدغ المؤمن من جحر مرتین۔ ابن حبان [۲۸۹۶] ذکر اثبات الخیر للمسلم الصابر.....

☆..... اس کے علاوہ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مؤمن کو زندگی بھر ہمیشہ ہی عموماً، اور تکلیف و پریشانی اور رنج و غم کے موقع پر خصوصاً انابت الی اللہ کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہئے، سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط و مستحکم کیا جائے، اسلامی احکام و فرائض و تمام شرعی عبادات و معاملات، خصوصاً نماز کی مکمل پابندی کی جائے، ذوق و شوق سے اور خوب دل لگا کر توجہ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے، ترجمہ و معانی کو سمجھنے کی کوشش بھی کی جائے، حرام آمدنی سے اجتناب اور رزقِ حلال کیلئے سعی و کوشش کی جائے، کسی کی دل آزاری نہ کی جائے، خلقِ خدا کو ستانے سے مکمل گریز کیا جائے، تمام معاصی و منکرات سے بچنے کا پختہ عزم کیا جائے، اللہ سے خوب دعاء و فریاد کی جائے، اسی سے ہی لو لگائی جائے، اسی سے مدد و اعانت طلب کی جائے، اور اس کے ذکر کا بکثرت اہتمام و التزام کیا جائے، کیونکہ مؤمن کیلئے دونوں جہانوں میں کامیابی و کامرانی کا راز اللہ کے ذکر میں ہی پوشیدہ ہے۔

ارشادِ باری ہے: ﴿وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور تم اللہ کو بکثرت یاد کیا کرو؛ تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو سکے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (۲) ترجمہ: (اور آپ صبر کیجئے، اور بغیر توفیقِ الہی کے آپ صبر کر ہی نہیں سکتے)

یعنی ہر پریشانی کے مقابلے کیلئے (خواہ وہ مالی پریشانی ہو، کوئی گھریلو مشکل ہو، کسی دشمن یا بدخواہ کی طرف سے ظلم و زیادتی کا سامنا ہو، یا کوئی بھی معاملہ ہو..... بہر صورت) انسان کو چاہئے کہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ اپنا تعلق مزید مضبوط و مستحکم کرنے کی فکر و جستجو کرے،

اسی پر توکل کرے، اور اپنا ہر معاملہ بس اسی کے حوالے کر دے، جس قدر اسے دنیا زیادہ ستائے، یا کسی بھی معاملے میں اس کی پریشانیوں میں جس قدر اضافہ ہو، اسی قدر اللہ کے ساتھ اس کی دوستی بڑھتی جائے اور اس کے ساتھ تعلق مضبوط و مستحکم ہوتا چلا جائے..... اور وہ ہمیشہ اس آیت کے معنی و مفہوم میں غور و فکر کرتا رہے: ﴿وَأَفْوَضْ أَمْرِى إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ (۱) ترجمہ: (میں تو اپنا معاملہ بس اللہ ہی کے حوالے کرتا ہوں، بے شک وہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے)

نیز: ﴿إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ (۲) ترجمہ: (میں تو اپنی پریشانیوں اور رنج و الم کی فریاد صرف اللہ ہی سے کرتا ہوں)

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ (۳) ترجمہ: (ہمیں خوب علم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، آپ اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں، اور سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں، اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے)

اس آیت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ انسان اپنے مخالفین کی طرف سے بدسلوکی یا اور کسی بھی وجہ سے جب کسی پریشانی سے دوچار ہو جائے تو ایسے میں ضرورت سے زیادہ رنجیدہ و افسردہ ہونے کی بجائے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ تسبیح و تحمید کا اہتمام کیا جائے اور اس کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط و مستحکم کرنے کی خوب فکر اور جستجو کی جائے۔

## (۴) خلاف مزاج باتوں پر صبر و تحمل:

یہ حقیقت ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اتنی بڑی انسانی آبادی میں محض کوئی دو انسان بھی ایسے نہیں ہو سکتے کہ ہر معاملے میں جن کا نظریہ بالکل ایک ہی جیسا ہو اور ان میں مکمل اتفاق رائے ہو۔ خواہ وہ باپ بیٹا ہوں، حقیقی بھائی ہوں، میاں بیوی ہوں، یا جو کوئی بھی ہوں۔ نہ ہی اس دنیا میں کوئی ایسا انسان ملے گا کہ پیدائش سے موت تک زندگی کے ہر قدم پر اور ہر معاملے میں اس کے تمام امور عین اس کی اپنی مرضی و خواہش کے مطابق طے پاتے ہوں، خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب۔ (۱)

چنانچہ زندگی کے اس سفر میں ہر انسان کو قدم قدم پر بہت سی خلاف مزاج باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہذا یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے اور ذہن نشین کر لینے کی اشد ضرورت ہے کہ ہمیشہ صبر و تحمل، وسعت صدر و رواداری، حلم و بردباری، دوسروں کی رائے کا

(۱) اس موقع پر عبرت کی غرض سے ایک مختصر سے واقعے کا تذکرہ مناسب رہیگا۔ ایک بار عید کے موقع پر میں نے ایک شخص کو نمازِ ظہر کے بعد مسجد میں کافی اداس و پریشان دیکھا۔ چونکہ اس سے میرا کچھ تعارف تھا اس لئے رسی دعاء و سلام کے بعد میں نے اس کی اس اداسی کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں وہ شخص یوں گویا ہوا کہ پاکستان میں گاؤں میں میرا بیٹا ہے جو کہ بہت ہی شریف اور فرمانبردار بھی ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے مسلسل ایسا اتفاق ہو رہا ہے کہ وہ ہر سال عید کے موقع پر مجھ سے یہ فرمائش کرتا ہے کہ میں اس کیلئے کچھ رقم ارسال کروں، تاکہ وہ موٹر سائیکل خرید سکے۔ میں اس کی یہ فرمائش ٹال نہیں سکتا اس لئے ہر سال یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس سال چونکہ مالی حالات درست نہیں ہیں، لہذا آئندہ سال عید کے موقع پر ضرور رقم ارسال کر دوں گا۔ مگر افسوس کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی میں اس کی یہ خواہش پوری نہ کر سکا..... حالانکہ وہ میرا انتہائی فرمانبردار بھی ہے.....!!

دوسرے ہی روز اتفاقاً ایک دعوت میں ایک صاحب کو اپنے بیٹے کے بارے میں نہایت ہی افسردگی اور حسرت و یاس کی کیفیت میں اس طرح شکوہ کرتے ہوئے سنا: ”میں نے عید سے ایک روز قبل اپنے بیٹے کو بالکل نئی گاڑی بطور ہدیہ بھجوائی، مگر ظالم کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ عید کے روز مجھے ٹیلی فون پر ہی ”عید مبارک“ کہہ دیتا.....!!“

احترام ”جیو اور جینے دو“ نیز ”کچھ لو، کچھ دو“ کا اصول اپنانا انتہائی ضروری ہے۔ جو کوئی خلاف مزاج باتوں پر صبر کو اپنا شیوہ و شعار بنائے گا وہی اس دنیا میں سکون و اطمینان اور عافیت و سلامتی کے ساتھ جی سکے گا۔ اس کے برعکس جو کوئی ہمیشہ بے صبری، تنگ نظری اور تنگ ظرفی کا مظاہرہ کرے گا وہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی اس عارضی و فانی زندگی کو مزید مشکلات و مصائب اور تلخیوں سے بھر پور بنا دیگا، زندگی بھر خود بھی بے چین و بے سکون رہے گا اور دوسروں کیلئے بھی آفات و مصائب اور پریشانیوں کے اسباب پیدا کرتا رہے گا.....!!

### (۵) مالی حالات کے معاملہ میں صبر و قناعت:

مال و دولت اور زمین جائیداد کے بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ اس دنیا میں انسان اگر صبر و قناعت کو اپنانے کی بجائے ہوسِ زراور حرص و طمع کا شکار ہو جائے تو پھر زندگی بھر سکون اور مسرت و اطمینان کی لذت سے محروم ہی رہے گا۔ ہوسِ زراکیہ منہ زور اور بے لگام گھوڑا اسے زندگی کے کسی بھی مرحلے پر پڑاؤ ڈالنے یا رکھنے اور سستانے کی مہلت ہی نہیں دیگا۔ فضول اور غیر ضروری خواہشات یا بے جا تمناؤں کے سراب کے پیچھے زندگی بھر دیوانہ وار دوڑتے دوڑتے وہ موت کی سرحد تک جا پہنچے گا، مگر اس کے باوجود متأسف، رنجیدہ و ملول اور بے چین و بے سکون ہی رہے گا.....!!

ارشادِ بانی ہے: ﴿الْهَآكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ رُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (۱) ترجمہ: (غفلت میں مبتلا کئے رکھا تمہیں زیادتی کی خواہش نے) (۲) یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے)

(۱) التكاثر [۱-۲] (۲) یعنی مال و دولت، زمین جائیداد اور آل و اولاد کی کثرت و فراوانی کی تمنا انسان کو زندگی بھر مسلسل غفلت میں مبتلا کئے رکھتی ہے وروہ اپنے انجام اور اس کیلئے تیاری کی فکر سے غافل و بے خبر رہتا ہے، یہاں تک کہ اپنی آخری منزل یعنی ”قبر“ میں جا پہنچتا ہے۔

فرض کیجئے کہ کوئی دو افراد ایسے ہوں کہ جن کی مالی ضروریات تقریباً ایک ہی جیسی ہوں، مگر دونوں کی آمدنی مختلف ہو، ایک کی آمدنی تو کم ہو، مگر اس کے باوجود وہ خوش و خرم رہتا ہو، سفید پوشی پر صبر و شکر کو اپنا شیوہ و شعار بنا رکھا ہو، اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتا ہو..... جبکہ دوسرے شخص کی آمدنی تو زیادہ ہو، مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ رنجیدہ و ملول ہی رہتا ہو، اس کے معصوم بچے ہر دم اور ہر لحظہ اس کی توجہ، ہمدردی اور محبت و شفقت کو ترستے ہوں..... مگر وہ ہمیشہ بس روپے پیسے کی کمی اور تنگی کا رونا ہی لئے بیٹھا رہتا ہو، اور یوں گھر کی فضاء کو کلدرد، افسردہ اور سوگوار بنائے رکھتا ہو..... ایسی صورت حال میں یقیناً یہی کہا جائیگا کہ پہلا شخص اپنی کم آمدنی کے باوجود ”امیر“ ہے۔ جبکہ یہ دوسرا شخص زیادہ آمدنی کے باوجود ”فقیر“ اور ”مسکین“ ہی کہلائے گا۔ کیونکہ مالدار ی یا تو نگری و خوشحالی کا تعلق مال و زر کی کثرت و فراوانی سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق تو ”دل“ سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: (لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ) (۱) ترجمہ (مالدار ی و تو نگری ظاہری مال و دولت سے نہیں، بلکہ اصل اور حقیقی مالدار ی تو دل کے استغناء کا نام ہے)

ابلیس نے جنت سے نکلنے وقت اولاد آدم سے انتقام کا جو عزم کیا تھا اور اس موقع پر اس نے جو دھمکیاں دی تھیں، ان میں سے ایک دھمکی یہ بھی تھی جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے: ﴿وَلَا ضَلَّانَهُمْ وَلَا مَنِّينَهُمْ﴾ (۲) ترجمہ: (میں انہیں گمراہ کرتا رہوں گا اور باطل امیدیں دلاتا رہوں گا.....)

یعنی شیطان کی ہمیشہ خواہش و کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ انسان کو فضول تمنائوں اور بے جا

خواہشات کے جال میں پھنسا دے اور زندگی بھر اسے دھوکہ و فریب اور محض خوابوں کی دنیا میں الجھائے رکھے، اور یوں خواہشاتِ نفس کی بندگی و غلامی میں ہی اس کی تمام زندگی بسر ہو جائے۔

فضول خواہشات، بے جاتمنائوں اور ہوسِ زر میں مبتلا حریص اور لالچی انسان خواہ کتنا ہی امیر و خوشحال ہو جائے اور دنیا بھر کے خزانے اس کے قدموں میں ہوں..... مگر اس کے باوجود وہ زندگی بھر بس روتا ہی رہے گا، اور پیسے کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو ہلکان کئے رکھے گا، کیونکہ ”مزید“ کی ہوس اسے کبھی چین سے نہ جینے دے گی۔ ایسے انسان کی کیفیت یہ ہوگی کہ مدتوں اور سالوں کسی چیز کے حصول کیلئے روتا رہے گا، اور جب وہ چیز اسے مل جائے گی تو بس دو چار دن اس کی خوشی منائے گا۔ اس کے بعد کسی اور چیز کیلئے رونا شروع کر دے گا..... آخر اسی طرح روتے روتے اس کی زندگی تو ختم ہو جائے گی، مگر خواہشات اور تمناؤں کا یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا.....!!

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَا يَبْتَغِي ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ) (۱) ترجمہ: (ابنِ آدم کو اگر مال و دولت سے بھر پور دو وادیاں بھی نصیب ہو جائیں، تب بھی وہ تیسری وادی کی تمنا کریگا، ابنِ آدم کا پیٹ تو بس قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے)

حریص و لالچی انسان اور مال و زر کا پجاری محض اپنے مفادات کے حصار میں ہی ہمیشہ کیلئے بند ہو کر رہ جاتا ہے، تمام رشتے ناتے وہ فراموش کر دیتا ہے، بس پیسہ ہی اس کا باپ ہے، پیسہ ہی اس کی اولاد ہے، پیسہ ہی اس کا محبوب ہے، پیسہ ہی اس کا دین و مذہب ہے.....

(۱) بخاری [۶۰۷۲] باب ما تَغْنِي مِنَ هَذِهِ الْمَالِ وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ هَتَفَةٌ..... نیز: مسلم [۱۰۴۸]

معاشرتی آداب و اخلاق (۱۸۳) ”صبر“ دنیا و آخرت میں کامیابی کا راز

بلکہ پیسہ ہی اس کا خدا ہے..... پیسے کی خاطر وہ تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے دیوانہ وار آگے بڑھنے کی کوشش میں شب و روز تگ و دو میں مشغول رہتا ہے، پیسے کی خاطر حلال و حرام کی تمیز کو پس پشت ڈال دیتا ہے، پیسے کی خاطر کسی بھی لمحہ وہ وحشی درندہ بھی بن سکتا ہے، کسی بڑے جرم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے، بلکہ کسی بے گناہ کا خون تک بہا سکتا ہے..... مگر ایسے انسان کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی زندگی بھر کی اس تگ و دو، جدوجہد، دیوانگی و بے چارگی، نیز روپے پیسے کی خاطر درندگی و سفاکی اور جرائم کے ارتکاب کے باوجود ہمیشہ ”مفلس و مسکین“ اور ”محتاج و فقیر“ ہی رہے گا، اور زندگی کی آخری سانس تک ”دو اور دو چار“ کا یہ چکر اسے کبھی سکون و اطمینان کی لذت سے آشنا نہ ہونے دے گا، اور وہ ہل من مزید کی فریاد اپنے ہونٹوں پر لئے ہوئے بے بسی و بے چارگی کے عالم میں اس عارضی وفانی دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جائے گا، اس کے وارث اس کے چھوڑے ہوئے مال و دولت سے خوب عیش و عشرت اڑائیں گے، جبکہ وہ خود اس دنیا سے بھی روتا ہوا جائے گا، اور اگر اس کا وہ مال حرام ذرائع سے حاصل شدہ ہو یا اس میں سے زکوٰۃ ادا نہ کی ہو، تو یہی مال اسے قبر میں بھی سکون نہ لینے دے گا، بلکہ سانپ اور بچھو بن کر قیامت تک اسے ڈستار ہے گا..... لہذا مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ مال و دولت کے معاملے میں ہمیشہ صبر و وقاحت سے کام لے، اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ ذہن نشین رکھے: (مَا أُعْطِيَ أَحَدٌ مِنْ عَطَاءٍ خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ) (۱) ترجمہ: (”صبر“ سے زیادہ بہتر اور کثادہ کوئی نعمت کبھی کسی کو عطاء نہیں کی گئی) یعنی ”صبر و وقاحت“ ایسی عظیم نعمت ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی اور نعمت کبھی کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

(۱) مسلم [۱۰۵۳] باب فضل الصبر والتخف - یہی حدیث بخاری میں [۶۱۰۵] اس طرح مروی ہے: وَلَئِنْ تَعَطُّوا عَطَاءَ خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ -



## ”شکرگذاری“ مؤمن کی خاص صفت

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ (۱) ترجمہ: (تم مجھے یاد کرو، میں بھی تمہیں یاد کروں گا، میری شکرگذاری کرو اور ناشکری سے بچو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾ (۲) ترجمہ: (اگر تم شکر ادا کرو تو وہ [اللہ] اسے تمہارے لئے پسند کرے گا)

حقیقت یہ ہے کہ انسان پر اس کے خالق و مالک کے بیشمار احسانات ہیں۔ کتنی ہی ایسی نعمتیں ہیں جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسان کو مانگے بغیر ہی عطا فرما رکھی ہیں۔ اللہ نے ہی انسان کو پیدا کیا، زندگی عطا فرمائی، رزق عطا فرمایا، صحت و تندرستی سے نوازا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی، دیکھنے، سننے، اور بولنے کی قوت دی، یہ دل و دماغ، یہ ہاتھ پاؤں، آنکھیں، ناک، کان، سر سے پاؤں تک اس کا تمام وجود ہی اللہ کی طرف سے احسانِ عظیم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تَعْدُوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا﴾ (۳) ترجمہ: (اور اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار بھی نہیں کر سکتے)

نیز ارشاد ہے: ﴿..... وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (۴) ترجمہ: (..... اسی نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر ادا کرو)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ .....﴾ (۱)  
 ترجمہ: (کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں؟ اور زبان اور ہونٹ نہیں بنائے.....؟)  
 انسان پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا یہ کس قدر احسانِ عظیم ہے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے  
 اس تمام کائنات کو انسان کے سامنے مسخر کر دیا ہے اور اس کی خدمت پر مامور فرما دیا ہے  
 تاکہ انسان اس کائنات سے اپنی ضرورت و مصلحت کے مطابق استفادہ کر سکے۔ قرآن  
 کریم میں جا بجا اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي  
 الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً﴾ (۲) ترجمہ: (کیا تم نہیں دیکھتے  
 کہ اللہ نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تمہیں اپنی ظاہری  
 و باطنی نعمتیں بھرپور دے رکھی ہیں)

نیز ارشاد ہے: ﴿أَلَلَهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً  
 فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ  
 بِأَمْرِهِ ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ،  
 وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ (۳) ترجمہ: (اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین  
 کو پیدا کیا ہے، اور آسمان سے بارش برسا کر اس کے ذریعے سے تمہاری روزی کیلئے پھل  
 نکالے ہیں، اور کشتیوں کو تمہارے بس میں کر دیا ہے کہ دریاؤں میں اس کے حکم سے چلیں  
 پھریں، اسی نے ندیاں اور نہریں تمہارے اختیار میں کر دی ہیں، اسی نے تمہارے لئے  
 سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے کہ برابر ہی چل رہے ہیں)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ان تمام احسانات اور بیشمار نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خلوص دل اور جذبہ صادق کے ساتھ اپنے خالق و مالک اور محسن و منعم کا شکر گزار بن کر رہے، اور ہر قسم کی ناشکری سے مکمل اجتناب کرے۔

شکرگزاری کی ضرورت و اہمیت نیز اس کی فضیلت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث میں جا بجا مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے عجز و انکسار، اطاعت و انقیاد اور تشکر و امتنان کا راستہ اپنایا، جبکہ اس کے برعکس فرعون اور قارون و ہامان وغیرہ کے بارے میں یہ تذکرہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ سرکشی و طغیانی اور نافرمانی کا مظاہرہ کر کے اپنی بدبختی کا ثبوت دیا۔

☆..... مثلاً قرآن کریم میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور ہم نے یقیناً داؤد اور سلیمان کو علم دے رکھا تھا، اور دونوں نے کہا: تعریف اس اللہ کیلئے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مؤمن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے)

اس کے بعد مزید اس بات کا تذکرہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی متعدد نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں پھر فرمایا: ﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ﴾ (۱) ترجمہ: (بیشک یہ تو بالکل کھلا ہوا فضل الہی ہے)

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ہی پھر یہی تذکرہ ہے کہ وہ اللہ کی

نعمتوں کا مشاہدہ کر کے یوں گویا ہوئے: ﴿..... هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي، لِيَبْلُوَنِي أَ أَشْكُرْ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ: (..... یہ تو میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکرگذاری کرتا ہوں یا ناشکری، جو کوئی شکرگذاری کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کیلئے [شکرگذاری] کرتا ہے، اور جو ناشکری کرے تو میرا رب یقیناً غنی [بے پرواہ] اور کریم ہے) ☆..... اسی طرح قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ تذکرہ ہے کہ عرصہ دراز اور ساہا سال کی جدائی و گم شدگی کے بعد جب ان کی اپنے والدین اور بھائیوں سے ملاقات ہوئی اور وہ سب یکجا ہوئے تو اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کسی شکوہ و شکایت یا نالہ و فریاد کی بجائے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے یوں کہا: ﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ (۲) ترجمہ: (اُس [اللہ] نے میرے ساتھ بڑا ہی احسان کیا جب کہ مجھے جیل خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحرا سے لے آیا، اس اختلاف کے بعد جو شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں ڈال دیا تھا، میرا رب جو چاہے اس کیلئے بہترین تدبیر کرنے والا ہے، اور بہت علم و حکمت والا ہے)

اس کے بعد آپ علیہ السلام اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے مزید احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے جذبہ احسان مندی و شکرگذاری سے لبریز ہو کر اپنے رب سے مناجات میں اس طرح مشغول ہو گئے: ﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ

فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۱﴾ ترجمہ: (اے میرے رب! تو نے مجھے ملک عطاء فرمایا اور تو نے مجھے خواب کی تعبیر سکھائی، اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے، تو مجھے اسلام کی حالت میں فوت کرا اور مجھے نیکیوں میں شامل فرما لے)۔

غور طلب بات یہ ہے کہ والدین سے سالہا سال کی جدائی اور ان کیلئے فطری تڑپ، بیقراری و بے چینی کے باوجود اس ملاقات کے موقع پر آپ علیہ السلام نے والدین کے سامنے رو رو کر بھائیوں کے مظالم، زہریلے حشرات الارض سے بھرپور اس بھیاںک اور ویران و سنسان کنوئیں میں گزرنی والی تکلیف دہ کیفیات، یا بے گناہی و بے قصوری کے باوجود سالہا سال تک جیل خانے میں قید و بند کی صعوبتوں و مشقتوں کا تذکرہ کر کے رونے اور رلانے کی بجائے محض اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا تذکرہ فرمایا اور ان احسانات پر انتہائی مؤثر و دل نشیں انداز میں جذبہ شکرگزاری کا اظہار فرمایا۔

☆..... خاتم الانبیاء والمرسلین، سید الاولین والآخرین، رسول اللہ ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ طویل شب بیداری اور نوافل کے دوران مسلسل قیام کی وجہ سے آپ کے قدم مبارک کی جلد میں شگاف پڑ جاتے تھے، نیز قدم مبارک سوچ جایا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت مغیرہ فرماتے ہیں: (قَامَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ ، فَقِيلَ لَهُ : غَفَرَ اللَّهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ ، قَالَ : أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا؟) (۲) ترجمہ: (نبی ﷺ رات کو [دوران نماز] اس قدر طویل قیام کیا کرتے تھے کہ آپ کے قدم

مبارک سوچ جایا کرتے تھے۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ: اللہ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما رکھے ہیں؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں [اللہ کا] شکر گزار بندہ نہ بنوں؟“۔

عن عائشة رضي الله عنها أنّ نبي الله ﷺ كان يقوم من الليل حتى تتفطر قدماه ، فقالت عائشة : لم تصنع هذا يا رسول الله وقد غفر الله لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر؟ قال : أفلا أحب أن أكون عبداً شكوراً؟ (۱) ترجمہ: (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو [دورانِ نماز] اس قدر طویل قیام کیا کرتے تھے کہ آپ کے قدموں [کی جلد] میں شکاف پڑ جایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ: ”اے اللہ کے رسول! آپ اس قدر مشقت کیوں فرماتے ہیں..... جبکہ اللہ نے تو آپ کے گزشتہ اور آئندہ تمام گناہ معاف فرما رکھے ہیں.....؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟“)

☆..... گزشتہ سطور میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے احسانات و انعامات پر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے طرزِ عمل، نیز ان کے جذبہٴ احسانِ مندی و شکرگزاری، اپنے خالق و مالک کی اطاعت و فرمانبرداری اور ہمہ وقت اس کی حمد و ثناء اور تسبیح و تحمید میں مشغول و منہمک اور رطب اللسان رہنے کے اس تذکرہ کے بعد ذرہ ملاحظہ ہو کہ اس طرزِ عمل کے برعکس، اللہ کے احسانات و انعامات پر جذبہٴ تشکر و امتنان اور اطاعت و انقیاد کی بجائے کفرانِ نعمت، تکبر و غرور، فخر و مباہات، نافرمانی و رگردانی اور سرکشی و طغیانی کن لوگوں کا شیوہ و شعار ہے؟

☆.....قرآن کریم میں قارون کے بارے میں یہ تذکرہ ہے کہ اللہ نے اسے بے انتہاء مال و دولت اور بے حد و حساب خزانوں اور ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا۔ لیکن جب اسے اس بات کی تلقین کی گئی کہ وہ ان نعمتوں اور مال و دولت کی فراوانی و بہتات پر فخر و غرور کی بجائے اپنے محسن و منعم کی اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اپنائے، اپنی آخرت سنوارنے کی کچھ فکر کرے اور اللہ کے دیئے ہوئے اس مال و دولت اور ان خزانوں میں سے کچھ حصہ بندگانِ خدا کی مدد، انسانیت کی فلاح و بہبود اور خدمتِ خلق کی راہ میں خرچ کرے..... تو وہ فوراً ہی مشتعل اور آگ بگولہ ہو گیا، اللہ کی نعمتوں کا یکسر انکار کرتے ہوئے، نیز حد درجہ ناشکری، بے مروتی اور بے حسی و سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یوں ہرزہ سرائی شروع کر دی: ﴿..... إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي﴾ (۱) یعنی: ”..... یہ سب کچھ تو میں نے خود اپنے ہی علم اور ذاتی دانش و حکمت سے کمایا ہے“

☆..... اسی طرح قرآن کریم میں فرعون کے بارے میں یہ تذکرہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اللہ کی طرف سے جب یہ حکم سنایا کہ وہ اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے سے باز آجائے، ظلم و ستم، کشت و خون اور مردم آزاری کا یہ سلسلہ اب بند کر دے..... تو وہ اس حکمِ خداوندی اور فرمانِ الہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے نافرمانی و روگردانی پر اڑ گیا، اور فوراً ہی اپنی بے حسی و بدبختی اور حد درجہ سرکشی و طغیانی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے خود اپنی ہی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، اور یوں گویا ہوا: ﴿..... أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾ (۲) یعنی: (تم سب کا بڑا اور حقیقی رب تو میں خود ہی ہوں.....)۔

گذشتہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی شکرگذاری و

احسان مندی اور اطاعت و فرمانبرداری انبیاء و صلحاء کا جبکہ اس کے برعکس ناشکری و نافرمانی اور سرکشی و طغیانی فرعون و قارون اور ان کے ہم خیال و ہمنوا قسم کے لوگوں کا شیوہ و شعار ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابلیس کو جب ملعون و مردود قرار دیتے ہوئے جنت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تو اس وقت اس نے قسم کھائی کہ چونکہ اسے آدم (علیہ السلام) کی وجہ سے جنت سے نکلنا پڑا ہے، لہذا وہ اولادِ آدم سے اپنی اس بے عزتی کا انتقام ضرور لے گا، اور اولادِ آدم کو بھی اس جنت سے دور اور محروم رکھنے کی ہر ممکن سعی و کوشش کرے گا، انہیں صراطِ مستقیم سے گمراہ و برگشتہ کرنے کیلئے ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہوگا، کبھی سامنے سے کبھی پیچھے سے، کبھی دائیں طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے.....!!

اور پھر مزید یہ دھمکی بھی دی کہ جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس طرح ہے: ﴿وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (ان میں سے اکثر کو تو شکر گزار نہ پائے گا) یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے ابلیس نے اس بات کا عزم کیا کہ: ”اے اللہ! ابنِ آدم کے بارے میں اتنا کارنامہ تو میں ضرور انجام دے کر رہی رہوں گا کہ ان میں سے اکثر کا حال یہ ہوگا کہ آپ کی عطاء کردہ تمام نعمتوں کے باوجود یہ بس آپ کی ناشکری ہی کرتے رہیں گے.....“۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ناشکری کرنے والا انسان دراصل شیطان کے زیر اثر ہے، اپنے خالق و مالک اور محسن و منعم کو ناراض کر رہا ہے، اور اپنے بدترین دشمن یعنی شیطان کو خوش کر رہا ہے۔ اگر اسے اللہ کی خوشنودی و رضا مندی کی طلب و جستجو ہوتی تو



معاشرتی آداب و اخلاق (۱۹۲) ”شکرگذاری“ مؤمن کی خاص صفت

وہ یقیناً اس کی ناشکری کی بجائے شکرگذاری و احسان مندی کا راستہ اختیار کرتا، اور اسے اس ارشادِ ربانی کی اہمیت کا احساس ہوتا: ﴿وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾ (۱) ترجمہ: (اگر تم شکر ادا کرو تو وہ [اللہ] اسے تمہارے لئے پسند کرے گا)

### ☆ شکر کی حقیقت:

شکر کی حقیقت کے بارے میں درج ذیل تین باتوں کو سمجھنا اور پھر انہیں اپنا نا ضروری و لازمی ہے:

(۱)..... انسان اپنے پاس موجود کسی بھی نعمت یا خوبی کو اپنا ذاتی کمال اور اپنا استحقاق تصور کرنے اور پھر اس کے بل بوتے پر تکبر و غرور اور خود پسندی و خود نمائی نیز دوسروں کی تحقیر و تذلیل کی بجائے اس نعمت کو خالصہً اپنے خالق و مالک کی طرف سے عطیہ اور احسان و انعام تصور کرے اور تہ دل سے اس کی شکرگذاری و احسان مندی بجالائے۔

(۲)..... دل کی گہرائیوں میں رچے بسے ہوئے اس جذبہ شکرگذاری و احسان مندی کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی انہی جذبات کا اقرار و اظہار کیا جائے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (۲) ترجمہ: (اور اپنے رب کی نعمتوں کو تو بیان کرتا رہ)۔

(۳)..... شکرگذاری و احسان مندی کے ان جذبات کا اپنی عملی زندگی میں بھی اقرار و اظہار کیا جائے، اپنی ہر نقل و حرکت اور ہر قول و فعل میں اس کا عملی ثبوت پیش کیا جائے، ان تمام نعمتوں کو اس منعم و محسن کی مرضی اور اس کی مقرر فرمودہ حدود و قیود کی مکمل رعایت و پابندی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

معاشرتی آداب و اخلاق (۱۹۳) ”شکرگزاری“ مؤمن کی خاص صفت

خلاصہ یہ کہ شکر محض اس چیز کا نام نہیں کہ انسان اٹھتے بیٹھتے بس اپنی زبان سے ”الحمد للہ“ کا ورد کرتا رہے..... جبکہ اسے اپنے عمل اور سیرت و کردار کی اصلاح کی طرف نہ کوئی توجہ ہو اور نہ ہی کوئی فکر یا جستجو.....!!

بلکہ شکر کی حقیقت تو یہ ہے کہ دل بھی جذبہ شکرگزاری و احسان مندی سے لبریز و سرشار ہو، زبان سے بھی اس کا اقرار و اظہار ہو، اور انسان کی تمام زندگی بھی اس محسن کی مرضی، اس کے احکام اور اس کی تعلیمات و ہدایات کے مطابق بسر ہو۔

☆ شکرگزاری کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے چند مفید نسخے:

(۱) ”رزق حلال“ کا اہتمام و التزام:

شکرگزاری کی توفیق صرف اسی انسان کو نصیب ہو سکتی ہے جس کا رزق حلال ہو، حرام کھانے والے انسان کو کبھی اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوگی، اس طرح وہ ”شکرگزاری“ کے عظیم فوائد و برکات سے محروم رہے گا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ تَعْبُدُونَهُ﴾ (۱) ترجمہ: (اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو)

غور طلب بات ہے کہ اس آیت میں حلال و پاکیزہ رزق کھانے کے حکم کے بعد فوراً ہی اللہ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے اسی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق تب ہی نصیب ہو سکے گی کہ جب رزق حلال کا اہتمام ہو اور رزق حرام سے مکمل گریز

اور اجتناب ہو۔

(۲) اللہ کے عذاب سے حفاظت و نجات کا ذریعہ:

”شکرگزاری“ کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے اس بارے میں غور و فکر کرنا چاہئے کہ ہر مسلمان کی یقیناً یہ سب سے بڑی خواہش و آرزو ہے کہ اسے دنیا و آخرت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے معافی و مغفرت، نیز اس کے عذاب سے نجات و حفاظت نصیب ہو جائے۔ اس مقصد کیلئے یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن کریم میں اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کیلئے یہ خوشخبری اور یہ وعدہ ہے کہ جب تک وہ صدق و اخلاص کے ساتھ ایمان پر قائم رہیں گے اور خلوص دل سے اُس کا شکر بجالاتے رہیں گے اس وقت تک وہ انہیں عذاب سے محفوظ و مامون رکھے گا۔

چنانچہ ارشادِ باری ہے: ﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا﴾ (۱) ترجمہ: (اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کریگا؟ اگر تم شکرگزاری کرتے رہو اور با ایمان رہو، اللہ بہت قدر کرنے والا اور پورا علم رکھنے والا ہے)

(۳) خوشحالی و آسودگی میں اضافہ و ترقی کا سبب:

یہ بات انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، اپنی ترقی و بہتری کی خاطر وہ زندگی بھر تک دود میں مشغول و منہمک رہتا ہے۔

اس مقصد کیلئے اسلامی آداب و تعلیمات اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے انسان جو بھی ترکیب و تدبیر مناسب سمجھے اسے اپنالے۔ مگر جو نسخہ خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بتایا ہے اسے ضرور اختیار کرے، کیونکہ انسان اپنی عقل و دانش کے مطابق از خود جو بھی طریقہ اختیار کریگا

اس میں یقیناً نفع و نقصان دونوں ہی چیزوں کا احتمال ہوگا۔ جبکہ اس مقصد کیلئے اللہ کا بتایا اور سکھایا ہوا طریقہ تو یقیناً مفید ہی ہوگا اور اس میں کسی خسارے کا کوئی امکان یا اندیشہ ہرگز نہیں ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس بارے میں اللہ کا بتایا اور سکھایا ہوا طریقہ کیا ہے؟  
اس سوال کے جواب کیلئے اس ارشادِ ربانی میں ذرہ غور کیا جائے: ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب تمہارے رب نے یہ اعلان فرمادیا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو بیشک میں تمہیں اور زیادہ دوں گا)  
لہذا اس بات کو خوب یاد رکھا جائے کہ اللہ کی عطا فرمودہ نعمتوں اور آسودگی و خوشحالی میں مزید ترقی و اضافہ اور خیر و برکت کیلئے اللہ کی شکرگزاری و احسان مندی ضروری ہے۔

#### (۴) نعمتوں کے تحفظ و بقاء کا ذریعہ:

انسان کیلئے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے حالات میں بہتری و ترقی کیلئے تگ و دو اور جدوجہد کی نسبت زیادہ فکر و جستجو اس بات کی کرے کہ جو نعمتیں پہلے سے اسے میسر ہیں کہیں وہ خدا نخواستہ ان سے بھی محروم نہ ہو جائے.....!!

فرض کیجئے کہ کسی شخص نے کسی کی کوئی مالی اعانت کی یا کوئی چیز اسے دی، اس پر وہ شخص خوشی و مسرت اور جذبہ شکر و نیاز مندی کے اظہار کی بجائے یا کم از کم یہ کہ خاموشی اختیار کرنے کی بجائے الٹا ناراضگی و ناگواری کا اظہار کرے..... ایسی صورتِ حال میں اس کی اعانت و مدد کرنے والا شخص یقیناً اسے یہی کہے گا کہ بھائی میری دی ہوئی چیز اگر تمہیں پسند نہیں تو میں اپنی یہ چیز تم سے واپس لے لیتا ہوں، تا کہ تمہاری یہ تکلیف و ناگواری دور ہو جائے..... اور

چونکہ دنیا میں بیشمار ایسے لوگ ہیں جو شدت و بے چینی کے ساتھ اس چیز کے منتظر و طلب گار ہیں..... لہذا میں ان میں سے کسی کو یہ چیز دے دوں گا تو وہ انتہائی خوش اور شادمان ہو جائے گا.....!!

اس مثال سے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ بعینہ یہی صورتِ حال اس انسان کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے جو اپنے خالق و مالک کی شکرگزاری و احسان مندی کی بجائے ہمیشہ شکوہ و شکایت ہی کرتا رہتا ہو..... ایسے انسان کو یہ سوچ کر اپنے اس رویے سے اور اس عادت سے باز آ جانا چاہئے اور توبہ و استغفار کی فکر کرنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ مجھے نصیب و میسر ہے، میری ناشکری و ناقدری کی وجہ سے اللہ وہ بھی مجھ سے واپس نہ لے لے.....!!

#### (۵) اپنے سے کم حیثیت افراد پر نظر:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (أَنْظُرْ إِلَى مَنْ تَحْتَكَ وَلَا تَنْظُرْ إِلَى مَنْ فَوْقَكَ، فَإِنَّهُ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرِي نِعْمَةَ اللَّهِ عِنْدَكَ) (۱) ترجمہ: (ہمیشہ اس شخص کی طرف دیکھو جو تم سے کم حیثیت ہو، جو کوئی تم سے بلند حیثیت ہو اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ، اس طرح تم اپنے پاس موجود اللہ کی نعمتوں کی ناقدری سے بچ سکو گے)۔

لہذا اس حدیث کی روشنی میں یہ اسلامی تعلیم ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ انسان کی نظر ہمیشہ ان لوگوں پر رہے جو مال و دولت، جاہ و منصب یا اور کسی بھی اعتبار سے اس سے کم حیثیت رکھتے ہوں۔ تاکہ اس طرح اس میں اللہ کا شکر ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ کیونکہ اس کے برعکس انسان کی نظر اگر اپنے سے بلند مرتبہ و مقام اور زیادہ حیثیت والے افراد پر رہے گی تو اسے کبھی اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوگی، بلکہ وہ تو الٹا احساسِ محرومی و کمتری کا

شکار ہو جائے گا، طرح طرح کے وسوسے اسے ستانے لگیں گے، ناشکری کے گناہ اور دنیا و آخرت میں اس کی نحوست و وبال کے علاوہ مزید یہ کہ وہ مخلف دینی و نفسیاتی، نیز اخلاقی امراض میں مبتلا ہو جائے گا، حسد، جلن، چڑچڑاپن، دوسروں کو لوٹ لینے اور چھین لینے جیسے جرائم کی طرف رغبت و میلان اور انتہائی خطرناک قسم کے جذبات و رجحانات اس کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جمانے لگیں گے، اوریوں وہ ہمیشہ زندگی بھر بس سلگتا اور جلتا ہی رہے گا.....!!

لہذا خود سے بلند حیثیت افراد کو دیکھنے کی بجائے ہمیشہ کم حیثیت افراد پر نظر رہے، تاکہ اس طرح دل میں اللہ کی شکرگذاری و احسان مندی کا جذبہ بیدار ہو اور یوں انسان اپنے لئے ہلاکت و بدبختی کا سامان کرنے کی بجائے سعادت مندی اور اللہ کی طرف سے مزید خیر و برکت اور اس کی رحمتوں اور نوازشوں کا حقدار بن سکے۔

### (۶) ”معدوم“ کی بجائے ”موجود“ پر نظر:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (۱) ترجمہ: (اور اپنے رب کی نعمتیں بیان کرتا رہ)

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان کو چاہئے کہ ہمیشہ ”موجود“ کو دیکھے اور معدوم کی فکر چھوڑ دے، یعنی جو نعمتیں اسے نصیب و میسر ہیں اس کی نظر بس انہی پر رہے، انہیں دیکھ کر وہ خوش ہوتا رہے، اٹھتے بیٹھتے انہی کا تذکرہ کرتا رہے، اور ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اور انہی کا تصور کر کے اللہ کا شکر ادا کرتا رہے، اور یہ کہ ”معدوم“ کی حسرت اور اس کا غم چھوڑ دے، یعنی جو نعمت اسے میسر نہیں ہے اس کی حسرت کرنے اور اس کے غم میں

رونے دھونے سے باز رہے۔

اس کی مزید وضاحت اس مثال سے ہو جانی چاہئے کہ فرض کیجئے کہ ایک شخص کی جیب میں سو سو روپے کے دو نوٹ ہوں، ان میں سے ایک نوٹ اگر کہیں گر جائے یا گم ہو جائے تو اس خسارے پر رنج و افسوس تو یقیناً طبعی و فطری امر ہے، مگر اس رنج و افسوس کو اپنے دل و دماغ پر مسلط نہ کرے، بس اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ پڑھے اور بے غم ہو جائے، اس خسارے کو بھول جائے، اور یہ سوچ کر خوش رہنے کی کوشش کرے کہ اللہ کا شکر ہے کہ صرف ایک ہی نوٹ گم ہوا ہے، دونوں گم نہیں ہوئے، اگر دونوں ہی گم ہو جاتے تو میں کیا کر لیتا.....؟ لہذا یہ تو میری خوش قسمتی ہو گئی کہ صرف ایک ہی نوٹ گم ہوا ہے اور دوسرا ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے.....!!

اسی طرح فرض کیجئے کہ خدا نخواستہ کسی کی گاڑی کا کسی دوسری گاڑی کے ساتھ تصادم ہو جائے تو اسے یہ سوچنا چاہئے کہ اللہ کا شکر ہے کہ گاڑی کے ساتھ ہی تصادم ہوا ہے، اگر خدا نخواستہ کسی ٹرک یا بس یا ریل گاڑی کے ساتھ تصادم ہو جاتا تو کیا بنتا.....؟

واقعہ مشہور ہے کہ کسی شخص کا دوران سفر کسی مقام پر جوتا گم ہو گیا، جس پر اسے بہت ہی رنج ہوا، نئی جگہ، نیا شہر، اور پھر یہ پردیسی اور مسافر انسان، کچھ اندازہ بھی نہیں کہ اب نیا جوتا کہاں سے مل سکے گا.....؟ ایسے میں یہ شخص اداس اور پریشان اور ننگے پاؤں شرمندہ شرمندہ لوگوں کے ہجوم میں جب بازار میں جوتوں کی کسی دکان کی تلاش میں گھوم رہا تھا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا..... تو ایسے میں اچانک اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی کہ جس کے پاؤں ہی نہیں تھے اور وہ بے چارہ اس قدر رش اور پرہجوم بازار میں گھسٹتا پھر رہا تھا..... یہ منظر دیکھ کر یہ شخص لرز گیا اور اسے عبرت حاصل ہوئی اور محض تھوڑی دیر قبل تک خود کو بد نصیب سمجھنے

والایہ انسان اب خود کو خوش نصیب تصور کرتے ہوئے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ جو تاگم ہو گیا تو کیا ہوا؟ الحمد للہ پاؤں تو سلامت ہیں، جوتے کا کیا ہے؟ ابھی یہاں کسی دکان سے نیال جائے گا، لیکن اگر خدا نخواستہ میرے پاؤں ہی نہوتے تو میں کیا کرتا.....؟ غرضیکہ اسی طرح ہر معاملے میں انسان کو یہی انداز فکر اختیار کرنا چاہئے کہ میں جس نقصان سے دوچار ہو گیا ہوں اس سے بڑا نقصان بھی تو ہو سکتا تھا..... اس سے بڑی کوئی مصیبت بھی تو آسکتی تھی..... مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بڑی مصیبت سے محفوظ و مامون رکھا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِي سِرْبِهِ ، مُعَافًى فِي جَسَدِهِ ، عِنْدَهُ قُوَّةٌ يَوْمَهُ ، فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَائِفِرِهَا) (۱) ترجمہ: (جس شخص کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے اپنے ٹھکانے میں امن و امان میسر ہو، اس کا جسم صحیح سلامت ہو، اس کے پاس اُس ایک دن کے کھانے کا انتظام موجود ہو، گویا دنیا کی تمام نعمتیں اس کے سامنے حاضر کر دی گئیں)۔

یعنی جب انسان کو کسی قسم کا کوئی جانی یا مالی خطرہ لاحق نہ ہو، صحت و تندرستی بھی نصیب ہو، کھانے کا انتظام بھی موجود ہو..... تو پھر اسے اور کیا چاہئے.....؟

مقصود یہ کہ انسان اپنے اندر رقناعت کا جذبہ پیدا کرے، جھوٹی تمنائوں اور خوابوں کی دنیا سے باہر آئے، سراب کے پیچھے دوڑتے رہنے سے باز آجائے، جو چیز اس کے پاس نہیں ہے اس کا غم چھوڑ دے، اور جو کچھ اسے نصیب ہے اس کی نظر اسی پر رہے، اس پر وہ راضی اور خوش رہے اور اپنے خالق و مالک کا شکر گزار بنارہے..... اسی میں اس کیلئے دینی سکون و دلی

(۱) ابن ماجہ [۴۱۴] یہی حدیث ترمذی [۲۳۴۶] میں بھی مروی ہے، البتہ اس میں آخر میں ”بحذائیرہا“ کے الفاظ نہیں ہیں۔



اطمینان، روحانی مسرت و شادمانی اور دونوں جہانوں میں سعادت مندی و کامیابی کا راز پوشیدہ ہے.....!!!

(۷) کبر و غرور سے پرہیز:

جس طرح فقر و فاقہ، مرض، یا اور کسی تنگی و پریشانی میں گرفتار انسان کے بارے میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اس کے پائے استقامت میں لغزش نہ آجائے اور وہ صبر و شکر کا دامن نہ چھوڑ بیٹھے..... بعینہ اسی طرح اس صورتِ حال کے برعکس خوشحالی و آسودگی اور مال و دولت کی کثرت و فراوانی یا اور کسی نعمت سے مالا مال انسان کے بارے میں بھی بسا اوقات یہی اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہی صورتِ حال پیش آ جاتی ہے..... اور ایسا شخص ان نعمتوں پر اپنے خالق و مالک اور منعم و محسن کی شکرگذاری و احسان مندی اور اس کے سامنے عجز و نیاز اور اطاعت و انقیاد کی بجائے فخر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور ان نعمتوں کو اپنا ذاتی کمال سمجھتے ہوئے منعم حقیقی سے دوری و روگردانی اختیار کرنے لگتا ہے.....!

حالانکہ انسانیت، شرافت اور مروت کا تقاضا تو یقیناً یہ ہے کہ بندے کیلئے اس کے خالق و مالک کی طرف سے جس قدر نعمتوں اور احسانات میں اضافہ ہو، اسی قدر بندے کی طرف سے بھی اپنے خالق و مالک اور منعم و محسن کی شکرگذاری و احسان مندی، اس کی اطاعت و فرمانبرداری، اور اس کے سامنے عجز و انکسار کے جذبات میں بھی ترقی و اضافہ ہوتا چلا جائے، اس مہربان آقا کے سامنے اس کی جبینِ نیاز جھکتی چلی جائے، اور اس کی ناشکری و نافرمانی کرتے ہوئے اسے شرم محسوس ہو، نیز یہ خوفِ دامن گیر رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی کسی حرکت یا لغزش سے ناراض ہو کر وہ منعم و محسن اپنی عطاء کردہ نعمتیں واپس لے لے.....!!

معاشرتی آداب و اخلاق (۲۰۱) ”شکرگذاری“ مؤمن کی خاص صفت

---

☆..... لہذا انسان کو اللہ کی عطاء کردہ نعمتوں پر تکبر و غرور کی بجائے یہ سوچ کر شکرگذاری و احسان مندی اور عجز و انکسار کا راستہ اختیار کرنا چاہئے کہ ”اللہ جس طرح نعمتیں دینے پر قادر ہے اسی طرح وہ اپنی دی ہوئی نعمتیں واپس لینے پر بھی خوب قادر ہے۔“



## ”شرم و حیا“

”شرم و حیا“ مرد کی زینت اور عورت کا زیور ہے، اسلامی تعلیمات و آداب کی رو سے ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ حیا دار اور باوقار ہو، بے حیائی، فحش گوئی، اور ہر لغو بات اور بیہودہ گفتگو سے پرہیز کرے، قرآن کریم میں اہل ایمان کی ایک علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ: ﴿هُم عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (جو لغویات سے منہ موڑ لیتے ہیں) یعنی اہل ایمان کی شان اور ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر لغو و بیہودہ بات یا بیہودہ کام سے پرہیز کرتے ہیں۔

شرم و حیا ایسی اہم ترین صفت ہے کہ جس پر انسانیت، شرافت، عزت، عفت، راست بازی پاکبازی و پاکدامنی کی بنیاد ہے، حقیقت یہ ہے کہ حیا اخلاق کی روح اور ہر خیر و خوبی کا منبع و سرچشمہ ہے، جبکہ بے حیائی ہر برائی کی جڑ ہے۔

حیا کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ (حیا) تو خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي إِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبِينَ) (۲) ترجمہ: (اللہ تو انتہائی باحیا اور بہت ہی مہربان ہے، جب کوئی بندہ دعاء کیلئے اس کی طرف اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے خالی ہاتھ اور نامراد لوٹاتے ہوئے اللہ کو حیا محسوس ہوتی ہے)۔

نیز حیا انبیائے کرام علیہم السلام کا خاص وصف ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں

(۱) المؤمنون [۳]

(۲) ترمذی [۳۵۵۶] ابوداؤد [۱۳۸۸] ابن حبان [۸۷۶] عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ۔

حدیث میں ہے کہ: (كَانَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خَدْرِهَا) (۱) یعنی: ”آپؐ کسی پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے“۔

بلکہ حیا تو ایمان کا لازمی جزء ہے اور مؤمن کی خاص پہچان ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لِكُلِّ دِينٍ خُلُقٌ وَ خُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ) (۲) ترجمہ: (ہر دین کا ایک خاص اخلاق ہوا کرتا ہے، اور دین اسلام کا خاص اخلاق ”حیا“ ہے) یعنی دنیا میں جتنے مختلف مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کے ماننے والوں اور پیروکاروں کا کوئی خاص مزاج ہوا کرتا ہے اور ان میں ایسی کوئی خاص صفت یا عادت نمایاں ہوتی ہے جو انہیں دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے اور جسے ان کی شناخت سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دین اسلام کا بھی ایک خاص امتیازی وصف اور ایک خاص پہچان ہے، اور وہ ہے: ”شرم و حیا“۔

اسی طرح ارشاد نبویؐ ہے: (الْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ) (۳) ترجمہ: (حیا تو ایمان کا حصہ ہے)

اسی طرح ارشاد نبویؐ ہے: (الْحَيَاءُ وَالْإِيمَانُ قُرْنَاءُ جَمِيعاً، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ) (۴) ترجمہ: (حیا اور ایمان دونوں ساتھی ہیں، دونوں میں سے کوئی ایک اگر ختم ہو جائے تو دوسری چیز بھی ضرور ختم ہو جائے گی)

یعنی ایمان اور حیا دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایمان ہوگا تو حیا بھی ہوگی، اور جس کسی میں حیا نہ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس میں ایمان بھی نہیں ہے۔

(۱) بخاری [۳۳۶۹] [۵۷۵۱] [۵۷۶۸] مسلم [۳۲۲۰] (۲) ابن ماجہ [۴۱۸۱]

(۳) بخاری [۹] باب قول أمّور الایمان وقول اللہ تعالیٰ: لیس البرآن تولو او جو حکم۔

(۴) الترغیب والترہیب [۳۹۹۷] بعض روایات میں قُرْنَا جَمِيعاً کے الفاظ ہیں۔ الأ دب المفرد [۱۳۱۳]

”حیا“ جنت میں داخلے کا سبب ہے، جبکہ بے حیائی انسان کو جہنم تک پہنچاتی ہے۔  
 ارشادِ نبویؐ ہے: (الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ وَالْإِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ ، وَالْبَذَاءُ مِنَ  
 الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ) (۱) ترجمہ: (حیا ایمان کا حصہ ہے اور ایمان جنت تک  
 پہنچاتا ہے، جبکہ بے حیائی سنگدلی کا حصہ ہے اور سنگدلی جہنم تک پہنچاتی ہے)  
 رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ) (۲) ترجمہ: (حیا سے  
 صرف بھلائی ہی پہنچتی ہے)

لہذا ایسا وصف جس میں انسان کیلئے، بلکہ تمام انسانی معاشرے کیلئے بھلائی ہی بھلائی ہو،  
 اور جو ایمان کا لازمی جزو ہو، مسلمان کو اس کی زیادہ سے زیادہ پاسداری اور حفاظت کرنی  
 چاہئے۔

”حیا“ ایک ملکوتی صفت ہے، حیا دار شخص انسانی روپ میں فرشتہ ہے، جبکہ بے حیا شخص  
 انسانی شکل میں بھیڑیا ہے، بلکہ وحشی درندہ ہے، ایسا شخص کسی بھی برائی یا بڑے سے بڑے  
 جرم کا بڑی بے خونی سے ارتکاب کر سکتا ہے، یہی مفہوم رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے  
 واضح ہے: (إِذَا لَمْ تَسْتَحْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ) (۳) ترجمہ: (جب تمہیں حیا نہ  
 آئے، تو جو چاہو کرو) یعنی جب انسان کی شرم و حیا ہی رخصت ہو جائے تو اب جو اس کے  
 جی میں آئے گا وہ کرتا پھرے گا۔ مثال مشہور ہے: ”بے حیا باش“ و ہرچہ خواہی گن۔“

نیز ارشادِ نبویؐ ہے: (مَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَةً ، وَمَا كَانَ الْفُحْشُ فِي  
 شَيْءٍ إِلَّا شَانَةً) (۴) ترجمہ: (حیا جس چیز میں بھی ہوگی اس میں رونق، خوبصورتی

(۲) بخاری [۵۷۶۶] مسلم [۳۷]

(۱) ابن حبان [۵۷۰۴] ابن ماجہ [۴۱۸۴]

(۴) ترمذی [۱۹۷۴] ابن ماجہ [۴۱۸۵]

(۳) بخاری [۵۷۶۹] احمد [۱۷۱۳۹] ابوداؤد [۴۷۹۷]

اور خیر و خوبی نمایاں ہو جائے گی، اور بے حیائی جس چیز میں بھی ہوگی اسے بدنما اور عیب دار بنادے گی۔

”شرم و حیا“ کی اہمیت اور اس کے برعکس بے حیائی کی قباحت و شاعت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں ”نماز“ جیسی اہم ترین عبادت کی حکمتوں اور بندے کیلئے اس کے عظیم فوائد و ثمرات میں سے ایک فائدہ یہ بیان کیا گیا کہ: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (۱) ترجمہ: (نماز روتی ہے بے حیائی سے اور برائی سے) قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نہایت تاکید کے ساتھ ہر قسم کی فحاشی و بے حیائی سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۲) ترجمہ: (بیشک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور قرابت داروں کو دینے کا، اور روکتا ہے بے حیائی کے کاموں سے، برائی سے اور ظلم و زیادتی سے، وہ تمہیں نصیحت فرما رہا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کر لو)

بلکہ فحاشی و بے حیائی اور بے شرمی کی بے پناہ مضرتوں اور انسانی معاشرے کیلئے اس کی لاحد و دوتاہ کاریوں کے پیش نظر قرآن کریم میں بے حیائی کے قریب پھٹکنے سے بھی باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلَا مَبْطُنَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے قریب بھی مت جاؤ، خواہ وہ علانیہ ہوں،

خواہ پوشیدہ)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَّنَ  
وَالْإِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۱) ترجمہ: (آپ فرمادیتے کہ یقیناً میرے رب نے  
حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں، اور ہر گناہ کی بات کو  
اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو)

اس آیت میں بطور خاص ”رب“ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ یقیناً وہ اللہ ہی اس  
تمام کائنات کا خالق و مالک ہے جس میں انسان بھی شامل ہے، اور خالق کا علم یقیناً مخلوق  
کے علم سے بڑھ کر ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا علم کامل ہے، بندے کا علم ناقص ہے،  
انسان کیلئے کیا چیز مفید ہے اور کیا چیز مضر؟ کس کام میں اس کیلئے بہتری ہے اور کس کام میں  
نقصان اور خرابی؟ اس بارے میں خود انسان سے بھی زیادہ علم اللہ کو ہے، جیسا کہ ارشادِ بانی  
ہے: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (۲) ترجمہ: (کیا وہی نہ  
جانے جس نے پیدا کیا؟ جبکہ وہ باریک بین اور باخبر بھی ہے)

یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس اللہ نے خود انسان کو پیدا کیا وہ اس کے دل کی کیفیات،  
یا اس کے پوشیدہ رازوں کو، یا اسی طرح اس کیلئے خیر اور شر، منفعت اور مضرت کو نہ پہچان  
سکے؟۔

لہذا جب خود انسان کے ”رب“ نے اسے فحاشی و بے حیائی سے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے  
تو یقیناً اس میں انسان کیلئے ہی کوئی بڑی حکمت اور منفعت و مصلحت پوشیدہ ہے اور اس حکم کی  
تعیل میں ہی اس کیلئے دونوں جہانوں میں عافیت و سلامتی کا سامان ہے۔

## ”اعتدال“

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ افراط و تفریط، انتہاء پسندی، غلو، شدت اور بے اعتدالی ایسی صفات یا خصوصیات ہیں جنہیں کبھی مفید یا پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا، شدت پسندی کے نتائج و ثمرات کبھی اچھے نہیں نکلتے۔

جبکہ اس کے برعکس ہر معاملے میں اعتدال و میانہ روی کو اختیار کرتے ہوئے بے جا سختی سے اجتناب کو ہمیشہ قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اور اس کے نتائج ہمیشہ ہی خوش گن اور مفید و مثمر رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ ، وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ) (۱) ترجمہ: (جس کام میں نرمی برتی جائیگی اس میں خیر و خوبی اور خوبصورتی پیدا ہو جائیگی، جبکہ جس کام میں سختی برتی جائیگی وہ بدنما اور عیب دار ہو جائیگا) نیز ارشاد ہے: (إِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ) (۲) ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نرم ہیں اور نرمی کو ہی پسند فرماتے ہیں، اور نرمی برتنے پر ایسی چیزیں عطا فرماتے ہیں جو سختی برتنے پر عطا نہیں کی جاتیں)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جب حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے اور اسے پیغام حق پہنچانے کا حکم دیا گیا تو اس موقع پر ان دونوں حضرات کو اللہ کی طرف سے یہ تاکید و تلقین کی گئی کہ اس ظالم و جابر، مغرور و تکبر، انتہائی سرکش و متبرّد، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے بالمقابل اپنی خدائی کا دعویٰ کرنے والے اس بیہودہ و گمراہ ترین انسان



کے سامنے بھی نرمی سے گفتگو کریں، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿إِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾ (۱) ترجمہ: (تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے تو بڑی سرکشی کی ہے، اسے نرمی سے سمجھاؤ کہ شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے)

خلاصہ یہ کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں یا کسی بھی معاملے میں جب نرمی و خوش اخلاقی اور وسعتِ ظرفی کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو وہ معاملہ خیریت و عافیت اور خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا جائے گا۔ جبکہ اس کے برعکس بے جا سختی و درشتی کی صورت میں وہاں مزید فساد اور بگاڑ ظاہر ہوگا، مزید الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔

نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مطلقاً نرمی بھی مقصود و مطلوب نہیں ہے، کیونکہ ضرورت سے زیادہ نرمی بھی بسا اوقات نقصان کا باعث بنتی ہے اور اس سے بہت سے مفسد ظاہر ہونے لگتے ہیں، لہذا اصل مقصود ”اعتدال“ ہے۔

بلکہ اس بارے میں اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آئیگی کہ لفظ ”اعتدال“ درحقیقت مأخوذ ہی ”عدل“ سے ہے، جس کے معنی ”برابری“ کے ہیں۔ لہذا اعتدال کے معنی ہی یہی ہوئے کہ ہر معاملے میں افراط و تفریط، کمی اور بیشی، نرمی اور سختی، تیزی اور سستی..... وغیرہ کا درمیانہ راستہ اختیار کیا جائے۔ جیسے کہ مثال مشہور ہے: (خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَطُهَا) یعنی ہر معاملے میں میانہ روی ہی بہترین راستہ ہے۔ (۲)

(۱) طہ [۴۳-۴۴]

(۲) یہاں یہ اشارہ ضروری ہے کہ مذکورہ عبارت یعنی: (خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَطُهَا) کے بارے میں اگرچہ مشہور یہ ہے کہ یہ حدیث ہے۔ لیکن مجھے تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی مستند حوالہ نہیں مل سکا۔ لہذا میں نے اسے ”حدیث“ کے طور پر یہاں درج نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

محاسنِ اسلام یا دینِ اسلام کی خوبیوں میں سے ایک اہم ترین خوبی یہی ہے کہ اسلام ”دینِ اعتدال“ ہے، قرآن کریم میں امتِ مسلمہ کو ”اُمّةٌ وسطاً“، یعنی درمیانی امت قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ (۱) ترجمہ: (اسی طرح ہم نے بنایا ہے تمہیں درمیانی امت)

اسی لئے دینِ اسلام میں زندگی کے ہر شعبے میں ”اعتدال“، یعنی میانہ روی کی تاکید و تلقین کی گئی ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اعمال سے یا معاملات سے۔  
اس بارے میں تفصیل درج ذیل ہے:

### (۱) عقائد میں اعتدال:

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے، اور ہر نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ تلاوت کرتا ہے، اس سورت میں اہلِ ایمان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اس دعاء کی تعلیم دی گئی ہے: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ (۲) ترجمہ: (دکھا ہمیں سیدھا راستہ، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کا جن پر غضب کیا گیا اور نہ ہی گمراہوں کا)

یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو یہ حکم ہے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے ”صراطِ مستقیم“ کی طرف ہدایت و توفیق طلب کریں، نیز جن لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو

(۱) البقرة [۱۴۳] یہاں یہ تذکرہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کے متعدد اردو تراجم میں اس آیت میں امتِ وسطاً کا ترجمہ ”افضل امت“ کیا گیا ہے، جو کہ یقیناً درست ہے، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اس ”افضلیت“ کی وجہ ”وسطیت“ ہی ہے، لہذا لفظی ترجمہ یعنی ”درمیانی امت“ بھی یقیناً درست ہے اور اس میں کوئی قباحت یا حرج نہیں۔  
(۲) الفاتحہ [۶-۷]

”صراطِ مستقیم“ سے بھٹک گئے، ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے حفاظت کی دعاء مانگیں۔

اس آیت میں غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ یعنی ”جن پر غضب نازل کیا گیا“ سے مراد یہود ہیں، جن کے بارے میں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر غضب اور لعنت کا تذکرہ ہے۔ جبکہ الضَّالِّينَ یعنی: ”گمراہوں“ سے مراد نصاریٰ ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یہود نے ہمیشہ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی نافرمانیاں اور ان کی شان میں گستاخیاں کیں، ان کی تعلیمات سے روگردانی کے مرتکب ہوئے، انہیں ہمیشہ ستایا اور تکلیفیں پہنچائیں، لہذا اپنے ان مکروہ جرائم اور اعمالِ بد کی پاداش میں وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے غضب اور لعنت کے حقدار قرار پائے، جس میں یقیناً کسی حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں۔

البتہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ”نصاریٰ“ کو کیوں ”گمراہ“ قرار دیا گیا اور ان کے دین یا ان کے افکار سے دوری و بیزاری اور کنارہ کشی اختیار کرنے کی کیوں تاکید و تلقین کی گئی.....؟ حالانکہ انہوں نے تو اپنے نبی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو کبھی کوئی اذیت نہیں پہنچائی، نہ ہی ان کی شان میں کبھی کوئی گستاخی کی، بلکہ اس کے بالکل برعکس انہوں نے تو اپنے نبی کی انتہائی عزت کی اور ان کے ساتھ ہمیشہ ہی تعظیم و تکریم کا رویہ و سلوک روا رکھا..... اس کے باوجود انہیں کیوں گمراہ قرار دیا گیا؟ نبی کی توہین و تحقیر اور نافرمانی و روگردانی تو یقیناً بہت بڑی برائی ہے، لیکن نبی کے احترام اور عزت و تکریم میں تو کوئی قباحت نہیں، بلکہ یہ چیز تو مطلوب و مقصود، بلکہ دین کا حصہ اور جزوِ ایمان ہے۔ تو پھر نصاریٰ کو کیوں گمراہ قرار دیا گیا اور ان کی تقلید یا ان کے عقائد اور افکار و خیالات کو اپنانے سے منع کیا گیا.....؟ اس سوال کا جواب یقیناً یہی ہے کہ نصاریٰ اپنے نبی کی اس تمام تر تعظیم و تکریم کے باوجود ”گمراہ“ ہی

ہیں، کیونکہ وہ اس تعظیم و تکریم میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے اور انہوں نے نبی کو اس مقام و مرتبے سے آگے بڑھا دیا کہ جو ان کیلئے اللہ کی طرف سے مقرر و متعین کیا گیا تھا۔  
لہذا عقیدے کی اس ”بے اعتدالی“ کی وجہ سے وہ گمراہ قرار پائے، اور ان کی اسی بے اعتدالی کی وجہ سے ہی قرآن کریم میں انہیں اس طرح تنبیہ کی گئی:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ.....﴾ (۱) ترجمہ: (اے اہل کتاب! اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گذر جاؤ، اور اللہ پر بجز حق بات کے اور کچھ نہ کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم تو صرف اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ [کُن سے پیدا شدہ] ہیں)۔

## (۲) عبادت میں اعتدال:

یہ بات قابل غور و فکر ہے کہ برے اعمال تو ایک طرف رہے، اچھے اعمال اور خالص عبادات میں بھی حد سے تجاوز کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲)  
ترجمہ: (اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے آسانی، اور وہ تمہارے لئے سختی نہیں چاہتا)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُم فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (۳)  
ترجمہ: (اُس [اللہ] نے دین کے بارے میں تم پر کوئی سختی نہیں ڈالی)

نیز ارشاد ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۴) ترجمہ: (تم اللہ سے ڈرتے رہو جہاں تک تم سے ہو سکے)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا) (۱) ترجمہ: (تم سہولت و نرمی

پیدا کرو مشکلات پیدا نہ کرو) یعنی دین میں بے جا تنگی و سختی سے گریز کرو۔

نیز ارشاد ہے: (إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ) (۲)

ترجمہ: (تمہیں سہولت و نرمی پیدا کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے نہ کہ مشکلات پیدا کرنے کیلئے)

اسی طرح ارشاد ہے: (إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ) (۳) ترجمہ: (دین تو یقیناً آسان ہی ہے)

یعنی دین اسلام کے پیروکاروں کیلئے یہ بات درست نہیں کہ دین کے معاملہ میں لوگوں کیلئے

بلا ضرورت تنگی و سختی اور مشکلات پیدا کی جائیں اور انہیں حرج و مشقت میں مبتلا کر دیا

جائے۔

اسی طرح ارشاد ہے: (هَآلِكَ الْمُتَنَطِّعُونَ) (۴) ترجمہ: (غلو کرنے والے تو ہلاکت

میں پڑ گئے) یعنی دین کے معاملہ میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے غلو کا راستہ اختیار

کرنا گویا ”ہلاکت و بربادی“ ہے۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی درج ذیل حدیث ملاحظہ ہو:

جاء ثلاثة رهط الى بيوت أزواج النبي ﷺ يسألون عن عبادة النبي ﷺ

فلمّا أخبروا كأنهم تقالّوها قالوا : فأنى نحن من رسول الله ﷺ عليه وسلم

وقد غفر له ما تقدّم من ذنبه وما تأخّر؟ قال أحدهم : أما أنا فأصلي

الليل أبداً ، وقال الآخر : وأنا أصوم الدهر ولا أفطر ، وقال الآخر : و

(۱) بخاری [۶۹] کتاب العلم - مسلم [۱۷۳۴] احمد [۱۲۳۵۵]

(۲) بخاری [۲۲۰] کتاب الوضوء - ترمذی [۱۷۷] نسائی [۵۶] [۳۳۰]

(۳) بخاری [۳۹] کتاب الایمان - نسائی [۵۰۳۴]

(۴) مسلم [۲۶۷۰] احمد [۳۶۵۵] ابوداؤد [۴۶۰۸]

أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ وَلَا أَتَزَوِّجُ أَبَدًا ، فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: أَنْتُمْ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَّا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتَقَاكُمْ لَهُ ، وَلَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ ، وَأَتَزَوِّجُ النِّسَاءَ ، فَمَنْ رَغِبَ عَن سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي (۱) ترجمہ: (رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت گزاری کے بارے میں دریافت کیا۔ جب انہیں اس بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو بہت ہی کم اور معمولی خیال کیا (۲) مگر پھر خود ہی آپس میں یوں کہنے لگے کہ: رسول اللہ ﷺ کی تو تمام گزشتہ و آئندہ لغزشیں اللہ نے معاف فرمادی ہیں، لہذا آپ کہاں اور ہم کہاں؟ (۳) پھر ان میں سے ایک نے کہا: ”میں تو بس پوری رات نماز میں ہی گزارا کروں گا۔“ دوسرا شخص بولا کہ: ”میں تو زندگی بھر روزانہ ہی روزہ رکھوں گا اور کبھی بے روزہ نہیں ہوں گا۔“ تیسرا شخص یوں کہنے لگا: ”میں زندگی بھر عورتوں سے دور ہی رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔“ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا: تم لوگوں نے ایسی ایسی بات کہی ہے؟ حالانکہ میں تو تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں، مگر اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور کبھی بے روزہ بھی ہوتا ہوں، رات کا کچھ حصہ نماز میں گزارتا ہوں اور کچھ حصہ سوکر بسر کرتا ہوں، اور میں نے تو شادیاں بھی کی ہیں [یہی میری سنت ہے] جس نے میری سنت سے بیزاری دکھائی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

☆..... البتہ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ جس طرح عبادت

(۱) بخاری [۴۷۷۶] کتاب النکاح۔

(۲) یعنی ان کا خیال یہ تھا کہ آپ ﷺ تو بہت زیادہ عبادت کرتے ہوں گے.....!!

(۳) یعنی رسول اللہ ﷺ تو بخشنے بخشنے ہیں جبکہ ہم تو گناہگار ہیں، اس لئے ہمیں خوب زیادہ عبادت کرنی چاہئے۔

ودیکر شرعی احکام و مسائل اور دینی فرائض و واجبات کے معاملے میں ”غلو“ اور بے جا سختی ناپسندیدہ ہے، بعینہ اسی طرح اس بارے میں تساہل و غفلت اور تقصیر و کوتاہی بھی یقیناً اور قطعاً ناقابل قبول ہے، ایسا ہرگز نہ ہو کہ انسان محض بیٹھے بٹھائے ہی آخرت میں راحت و کامیابی، جہنم سے نجات اور جنت کی لازوال و بے مثال اور دائمی وابدی نعمتوں کی تمنا کرتا رہے..... جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

تَرْجُو النَّجَاةَ وَلَمْ تَسْلُكْ مَسَالِكَهَا    إِنَّ السَّيْفِينَةَ لَا تَجْرِي عَلَى الْيَبَسِ  
یعنی: ”تم آخرت میں نجات کی امید تو لگائے بیٹھے ہو..... مگر نجات کے راستے پر تو تم چلتے ہی نہیں.....؟ کیا کبھی کوئی کشتی خشکی پر بھی تیر سکتی ہے.....؟“

مقصد یہ کہ اگر دریا کے اُس پار جانے کی خواہش و تمنا ہے تو پہلے کشتی کو خشکی سے اٹھا کر پانی میں ڈالاجائے اور اس کے بعد یہ امید کی جائے کہ یہ کشتی اب ہمیں اُس پار پہنچا دے گی۔ لہذا آخرت میں نجات اور وہاں کی راحت و کامیابی کی اگر حقیقی طلب ہو تو اس مقصد کیلئے عملی کوشش اور حقیقی جدوجہد ضروری ہے۔ البتہ اسلام کی تعلیم اعتدال کے تقاضے بھی ملحوظ رہیں۔

### (۳) معاشرت میں اعتدال:

عزیز و احباب و دیگر متعلقین کے ساتھ میل جول اور ملاقات وغیرہ کے معاملے میں بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ نہ تو ایسی غفلت و کوتاہی کا مظاہرہ کیا جائے کہ غلط فہمیاں اور دلوں میں فاصلے پیدا ہونے لگیں، اور نہ ہی باہمی تعلق اور آمد و رفت اس قدر بڑھ جائے کہ انسان بالکل ہی بے وقعت ہو کر رہ جائے.....!!

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (رُزْ غِبًّا تَزِدُّ حُبًّا) (۱) ترجمہ: (میل جول ذرہ کم رکھا کرو، اس سے محبت میں اضافہ ہوگا)

مثال مشہور ہے: ”قدر کھودیتا ہے ہر روز کا آنا جانا“۔

نیز دوسروں کے ساتھ رویہ و سلوک میں بھی نہ تو بے رخی و بے التفاتی اور سرد مہری کا مظاہرہ کیا جائے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ گرم جوشی دکھائی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَّا، عَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَّا، وَ أَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَّا، عَسَى أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَّا) (۲) ترجمہ: (تم اپنے دوست کے ساتھ دوستی حد کے اندر رکھو، کیونکہ عین ممکن ہے کہ تمہارا یہی دوست کل تمہارا دشمن بن جائے، اسی طرح دشمن کے ساتھ دشمنی بھی حد کے اندر رکھو، کیونکہ عین ممکن ہے کہ تمہارا یہی دشمن کل تمہارا دوست بن جائے)

یعنی آج کا دوست کل دشمن بن سکتا ہے، اس لئے دوستی میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اسی طرح آج جس کے ساتھ دشمنی ہے، کل یہ دشمنی دوستی میں بدل سکتی ہے، اس لئے دشمنی میں بھی تم حد سے آگے نہ بڑھو اور دشمن کے خلاف کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھو کہ کل اگر اس سے دوستی ہو جائے تو پھر زندگی بھر حسرت و افسوس رہے اور اس کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی و ندامت کا احساس ہو۔

نیز کہاوت مشہور ہے: ”نہ اس قدر کڑوے ہو کہ دنیا تھوکنے پر مجبور ہو جائے، اور نہ ہی اتنے

(۱) الترغیب والترہیب [۳۹۰۰] بحوالہ: الطبرانی والبرز، البیہ بعض اہل علم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) ترمذی [۱۹۹۷] باب ما جاء في الاقتصاد في الحب والبغض۔ نیز امام بخاری نے الألبانی [۱۳۲۱] باب: أحب حبیبک ہونا ما کے تحت حضرت علیؓ سے مروی ”اثر“ کے طور پر یہ ذکر کیا ہے۔



بیٹھے بنو کہ دنیا تمہیں ہڑپ کر جائے.....!“

اس کے علاوہ یہ کہ ضرورت سے زیادہ گرم جوشی کے مظاہرے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ بعض اوقات دوسروں کو یہ مغالطہ ہونے لگتا ہے کہ شاید اس کے پیچھے کوئی ذاتی مفاد یا مصلحت پوشیدہ ہے؛ جس کی وجہ سے اس قدر گرم جوشی و خوش اخلاقی دکھائی جا رہی ہے..... لہذا ایسی کسی بدگمانی سے بچنے کیلئے بھی اس معاملے میں ”حدِ اعتدال“ کو قائم و ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

### (۴) کھانے پینے میں اعتدال:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿..... وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (..... اور تم کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو، بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں فرماتا)

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ لَقِيمَاتُ يَقْمَنَ صَلْبَهُ ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَهَ ، فَتُلْتُ لَطْعَامِهِ ، وَتُلْتُ لِشَرَابِهِ ، وَتُلْتُ لِنَفْسِهِ) (۲) ترجمہ: (ابنِ آدم کیلئے تو کھانے کے محض چند لقمے ہی کافی ہو جانے چاہئیں کہ جن سے وہ بس اپنی کمر سیدھی رکھ سکے۔ اور اگر کبھی وہ اس سے زیادہ کھانا ہی چاہے تو [معدے کا] ایک حصہ کھانے کیلئے اور ایک حصہ پانی کیلئے اور ایک حصہ سانس کیلئے مخصوص رکھے)

رسول اللہ ﷺ کے سکھائے ہوئے اس زریں اصول کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ

(۱) الاعراف [۳۱]

(۲) احمد [۱۷۲۲۵] ترمذی [۲۳۸۰] بعض روایات میں لَقِيمَاتُ کی بجائے أَكِيلَاتُ اور بعض میں أَكَلَاتُ

کے الفاظ ہیں۔

کھانے پینے میں بھی افراط و تفریط کی بجائے ”اعتدال“ ضروری ہے۔ مؤمن کی سوچ یہ ہونی چاہئے کہ وہ کھانے پینے کیلئے زندہ نہیں ہے، بلکہ اس کا کھانا پینا محض زندہ رہنے کیلئے ہے۔ یعنی کھانے کیلئے نہ جئے، بلکہ جینے کیلئے کھائے، کھانے کو بذاتِ خود مطلوب و مقصود نہ سمجھے، بلکہ اصل مقصود اپنے خالق و مالک کی عبادت، نماز و دیگر فرائضِ دینیہ کی ادائیگی، نیز روزمرہ کے دیگر ضروری کام کاج کی انجام دہی ہے۔ لہذا اس اصل مقصود کی ادائیگی و انجام دہی کی خاطر بطورِ استعانت محض حسبِ ضرورت کھانے پینے کا اہتمام ہو۔

نیز ضرورت سے زیادہ کھانے پینے میں حیوانات کے ساتھ مشابہت بھی ہے۔ زیادہ کھانے کی وجہ سے انسان میں حسِ لطافت، انسانیت، اور اپنے خالق و مالک کیلئے اطاعت و انقیاد کے جذبات میں کمی واقع ہونے لگتی ہے، اس کے دل و دماغ پر بیجانی کیفیت اور شہوانی خیالات کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔

اسی لئے ایسے فاسد خیالات اور خطرناک کیفیات سے حفاظت و نجات کی غرض سے ہی روزہ رکھنے کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وَجَاءٌ) (۱) ترجمہ: (اے نوجوانو! تم میں سے جو کوئی شادی کی استطاعت رکھتا ہو وہ شادی ضرور کرے، ورنہ روزہ رکھا کرے، کیونکہ یہ روزہ [شہوانی خیالات سے حفاظت کیلئے] ڈھال ہے)۔

نیز یہ کہ قدیم و جدید اطباء و حکماء بھی بسیار خوری کے نقصانات کے معترف ہیں اور ہمیشہ اس سے اجتناب کی تاکید و تلقین کرتے چلے آئے ہیں، مقولہ مشہور ہے: ”کم خوردن، کم خفتن، کم“

گفتن عادت گیر، یعنی: ”کم کھانے، کم سونے، اور کم بولنے کی عادت اپناؤ“۔ لہذا کھانے پینے کے معاملے میں بھی ”اعتدال“ ضروری ہے۔

### (۵) مالی اخراجات میں اعتدال:

قرآن کریم میں اہل ایمان کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ خرچ کرتے وقت نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ ہی بخل، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ بخل اور اسراف دونوں ہی ناپسندیدہ طریقے ہیں، لہذا مومن کیلئے ان دونوں سے ہی اجتناب ضروری ہے۔

بخیل انسان اللہ کی عطاء کردہ نعمتوں، مال و دولت، و دیگر وسائل میسر ہونے کے باوجود حقیقی اور واقعی ضرورت کے موقع پر بھی روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے، مالی حیثیت و استطاعت کے باوجود اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز و مباح ضروریات بلکہ نفقات واجبہ کے سلسلے میں بھی مال خرچ کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور تنگ دلی محسوس کرتا ہے، گویا وہ بزبان حال اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ اسے اللہ پر توکل و اعتماد نہیں ہے، اور یہ کہ اللہ پر اس کا ایمان ناقص ہے۔

جبکہ اس کے برعکس اسراف و فضول خرچی کا عادی انسان اپنے پاس موجود اللہ کے عطاء کردہ مال و دولت و دیگر نعمتوں کو انتہائی بے دردی و بے رحمی سے اڑاتا ہے، اور یوں خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے اوپر، نیز اپنے بچوں پر ظلم عظیم کرتا ہے..... خود اپنے لئے، نیز اپنے بچوں کیلئے

مستقبل میں بربادی محتاجی اور مفلسی و بے چارگی کا انتظام کرتا ہے، کیونکہ سوچے سمجھے بغیر بلا ضرورت اور بے دریغ مال و دولت اڑانے والا انسان یقیناً ایک روز مفلس محتاج اور کنگال و برباد ہو کر ہی رہے گا۔ اسی حقیقت کی طرف اس ارشادِ ربانی میں اشارہ کیا گیا ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ (۱) ترجمہ: (اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ ہی اسے بالکل ہی کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہو اور ماندہ بیٹھ جائے)

یعنی اپنی حیثیت و استطاعت اور گنجائش دیکھے بغیر بے دریغ روپیہ پیسہ خرچ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان قابلِ مذمت و ملامت قرار پائے گا اور حسرت و ندامت کے سوا اس کے پاس کچھ باقی نہ بچے گا.....!!

اللہ کے عطاء کردہ مال و دولت و دیگر نعمتوں کو بے دریغ خرچ کرنے والے نادان انسان کو یہ حقیقت خوب ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں

لہذا مال و دولت خرچ کرنے کے معاملے میں بھی کنجوسی و بخل نیز فضول خرچی و اسراف دونوں سے گریز کرتے ہوئے ”اعتدال“ کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

## (۶) دین و دنیا میں توازن و اعتدال:

اسلام دینِ فطرت ہے، اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کی بناء پر ہی انسان کی بہت سی فطری حاجات و ضروریات ہیں، لہذا اسلام نے انسان کو اس کی ان فطری ضروریات و حاجات کو ترک کر دینے اور جلی و طبعی تقاضوں کا گلابا دینے یا ان سے کنارہ کشی و دوری اختیار

کر لینے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

البتہ ان فطری و طبعی حاجات و ضروریات کی تکمیل کیلئے دین اسلام نے مناسب حدود و قیود اور قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں، جن کی پابندی میں ہی تمام دنیائے انسانیت کیلئے اول و آخر راحت و سکون اور صلاح و فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔

اسی طرح اسلام نے انسان کی ان فطری حاجتوں اور طبعی تقاضوں سے کنارہ کشی و فرار اور ترک دنیا کا راستہ اختیار کر لینے کے برعکس، دنیاوی و مادی لذتوں اور مال و دولت کی طلب میں ضرورت سے زیادہ انشغال و انہماک، ہوسِ زر و دنیا پرستی، پیسے کی غلامی، دنیا کی ان عارضی و فانی لذتوں اور مصلحتوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑنے اور ان کی طلب و تلاش میں اپنے خالق و مالک کو فراموش کر دینے، شرعی احکام و مسائل کو پس پشت ڈال دینے، دینی، اخلاقی، و معاشرتی فرائض و واجبات اور ذمے داریوں سے منہ موڑ لینے سے بھی نہایت سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

قرآن وحدیث میں جا بجا مال و زر کی غلامی اور دنیا کی عارضی و فانی نعمتوں و لذتوں میں انشغال و انہماک سے باز رہنے کی تاکید و تلقین کی گئی ہے، اور اس کے برعکس آخرت کی دائمی وابدی اور لازوال و بے مثال نعمتوں کے حصول کیلئے مخلصانہ کوشش اور حقیقی جدوجہد کی ترغیب دی گئی ہے۔

مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ﴾ (۱)

ترجمہ: (تمہارے پاس جو کچھ ہے سب فانی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے باقی رہنے والا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ وَأَبْقَى﴾ (۱)  
ترجمہ: (لیکن تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، [حالانکہ] آخرت تو بہت بہتر اور بہت  
بقاء والی ہے)

☆..... یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہود نے ہمیشہ اپنے خالق و مالک اور خدائے  
بزرگ و برتر کی عبادت و بندگی کی بجائے مال و دولت کی غلامی و پرستش کا راستہ اختیار کیا،  
پیسے کو اپنا مطلوب و مقصود بلکہ اپنا معبود بنایا، دنیا کے حقیر و معمولی اور عارضی و فانی مفادات  
کی خاطر اللہ کے دین کو اور اس کی آیتوں کو بیخ ڈالا، جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر  
ان کی اس دین فروشی اور اس فتنج و مذموم ترین حرکت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس پر انہیں  
تنبیہ و توبیخ کی گئی ہے۔

مثلاً ارشادِ باری ہے: ﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِنِّي فَاتَّقُونَ﴾ (۲)  
ترجمہ: (اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت کے عوض بیچ نہ ڈالو اور صرف مجھ سے ہی ڈرتے  
رہو)۔

☆..... جبکہ اس کے برعکس دوسری طرف نصاریٰ نے اللہ کی بنائی ہوئی فطرت سے  
روگردانی کرتے ہوئے فطری و طبعی لوازم و ضروریات سے منہ موڑا، سماجی و معاشرتی ذمہ  
داریوں سے فرار اختیار کرتے ہوئے گوشہ نشینی ترک دنیا اور ”رہبانیت“ کا راستہ اختیار کیا،  
اور اسے دین کا حصہ اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ و وسیلہ تصور کیا، جس پر قرآن کریم  
میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ان کی مذمت کی گئی اور ان کے اس اندازِ فکر اور طرزِ عمل  
کو غلط قرار دیا گیا۔

دین و دنیا میں توازن و اعتدال کی اسلامی تعلیم اور اس بارے میں اسلامی نقطہ نظر اور اندازِ فکر اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں بخوبی واضح ہو جاتا ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (۱)

ترجمہ: (اور جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے، اس میں سے آخرت کے گھر کی طلب بھی رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول) (۲)

نیز اس اسلامی تعلیم اعتدال کی جھلک رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں بھی نمایاں ہے:

وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمُ لِلَّهِ وَأَتَقَاكُمُ لَهُ ، وَلِكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ، فَمَنْ رَغِبَ عَن سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي (۳)

ترجمہ: (اللہ کی قسم! میں تو تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں، مگر اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور کبھی بے روزہ بھی ہوتا ہوں، رات کا کچھ حصہ نماز میں گزارتا ہوں اور کچھ حصہ سو کر بسر کرتا ہوں، اور میں نے تو شادیاں بھی کی ہیں [یہی میری سنت ہے] جس نے میری سنت سے بیزاری دکھائی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں)

مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ ”ترکِ دنیا“ یا اس کے برعکس ”دنیا پرستی“ کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے اس معاملے میں توازن و اعتدال کی راہ اپنائے، فکرِ آخرت کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی دنیاوی ضروریات اور فطری تقاضوں کی تکمیل کی فکر بھی کرے۔

[۱] القصص [۷۷]

(۲) اگرچہ یہ آیت قارون کے واقعے کے ضمن میں آئی ہے، لیکن یقیناً اس کا مفہوم عام ہے اور یہ پیغام سب ہی انسانوں کیلئے ہے۔

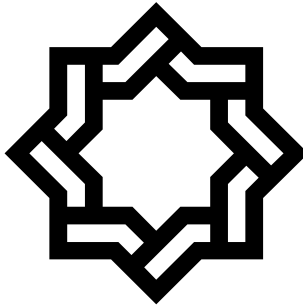
(۳) بخاری [۴۷۷۶] کتاب النکاح۔

البتہ ان دنیاوی ضروریات کی فکر اور ان میں انشغال و انہماک ایسا نہ ہو کہ ان کی محبت انسان کے قلب و ذہن میں راسخ و پیوستہ ہونے لگے، کیونکہ جس طرح کشتی کے تیرنے کیلئے اس کے نیچے پانی کی موجودگی تو یقیناً ضروری ہے، لیکن اگر یہی پانی کشتی کے اندر گھس آئے..... تب تباہی و بربادی یقینی ہو جائیگی.....!!

بعینہ اسی طرح دنیاوی ضروریات اور فطری تقاضوں کی تکمیل اور اس مقصد کیلئے مباح و مشروع وسائل اختیار کرنا اور مناسب کوشش و جدوجہد تو یقیناً ضروری ہے، لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ دنیاوی ضروریات اور مال و اسباب وغیرہ کی محبت ہرگز ہرگز دل کے اندر داخل نہ ہو، اور کسی صورت اللہ کی محبت اور فکرِ آخرت پر غالب نہ آنے پائے۔







# اسلامی معاشرہ

اور

# حقوق العباد



## اسلامی معاشرے میں والدین کا مقام و مرتبہ:

انسانی معاشرے میں جب بھی حقوق العباد کی بات ہوگی تو یقیناً سب سے پہلے والدین کا تذکرہ ہوگا، کیونکہ والدین ہی انسانی معاشرے کی اساس اور اس کی اصل ہیں، اگر یہ اصل مضبوط و صحیح سلامت رہے تو معاشرے کا درخت سرسبز و بار آور رہے گا، اسی وجہ سے اسلام نے والدین کو انتہائی بلند مقام و مرتبہ سے نوازا ہے۔

انسان کیلئے اس کے والدین درحقیقت ”صفتِ ربوبیت“ کا مظہر ہوا کرتے ہیں۔ یعنی ہر انسان کا خالق حقیقی تو یقیناً اللہ ہی ہے (اسی لئے ہر قسم کی عبادت کا مستحق بھی صرف وہی ہے) لیکن انسان کی پیدائش کیلئے اللہ نے ظاہری سبب اس کے والدین کو بنایا ہے۔

اسی طرح کسی بھی انسان کے بچپن میں اس کی ”تربیت“ کرنے والا وہ ”رب“ تو یقیناً اللہ ہی ہے، مگر اس ”تربیت“ کیلئے اللہ نے ظاہری اور براہِ راست سبب اس کے والدین کو بنایا، اور اس کے والدین کے دل میں اس کیلئے اس قدر محبت و مودت اور رحمت و ہمدردی کے جذبات ڈال دیئے کہ والدین زندگی بھر اپنے بچے کی خاطر ہر قسم کی تکلیف و مشقت ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں، اپنی راحت و آرام کو اولاد کی راحت پر قربان کر دینے کیلئے ہمہ وقت مستعد و تیار رہتے ہیں، بوقتِ مجبوری خود روکھی سوکھی کھا لیتے ہیں، مگر اولاد کیلئے بہر صورت اچھی غذا کی فکر و جستجو میں لگے رہتے ہیں، خود معمولی لباس پہن کر گزارا کر لیتے ہیں، مگر اولاد کیلئے حتی المقدور مناسب لباس کا انتظام کرتے ہیں، تاکہ ان کی اولاد زمانے کے گرم و سرد سے محفوظ رہ سکے۔

والدین کی محبت و شفقت اولاد کیلئے رحمتِ باری کا سا بنان ہے، جو انہیں آفاتِ زمانہ کی تپتی

کڑکتی دھوپ سے بچا کر پروان چڑھاتی ہے، اسی لئے یہ ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ اس کارخانہ دنیا میں انسانیت کا وجود خالق کائنات کے بعد والدین ہی کا مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر والدین کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے حکم کو اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّكَ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَخَفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ (۱) ترجمہ: (تمہارے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اُس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور یہ کہ تم اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُس وقت انہیں کبھی ”اُف“ بھی مت کہنا، اور نہ اُن کو جھڑکنا، اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا، اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا، اور اُن کیلئے یوں دعاء کرتے رہنا کہ: ”اے میرے رب! تو ان دونوں پر رحمت فرما، جیسا کہ انہوں نے مجھے اُس وقت پالاجب میں چھوٹا تھا۔“)

☆..... اس آیت میں انسان کو اس کے خالق و مالک کی طرف سے اپنی عبادت و بندگی کے حکم کے بعد فوراً ہی والدین کی اطاعت و فرمانبرداری، ان کی خدمت و خبرگیری، ان کے سامنے تواضع و انکسار اور خوش گفتاری، نیز ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے ادب و احترام کی انتہائی موثر و دلنشین انداز میں تاکید و تلقین کی گئی ہے، اور اس طرف اشارہ بھی

کیا گیا ہے کہ والدین کی خدمت و اطاعت تو یقیناً ہمیشہ ہی ضروری و لازمی ہے، مگر اس چیز کی ضرورت و اہمیت خصوصاً اُس وقت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جب والدین اپنی زندگی کا سنہری دور اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اولاد کی تربیت و نگہداشت پر صرف کرنے اور ان کی ترقی و بہتری کی خاطر اپنی تمام تر ضروریات و خواہشات کو قربان کر دینے کے بعد اب زندگی کے اُس موڑ پر آپہنچے ہوں جہاں اعصاب جواب دے چکے ہوں، جسمانی و ذہنی قومی مضحمل ہو چکے ہوں، ہمت ریزہ ریزہ ہو چکی ہو، اندیشوں، وسوسوں، مختلف بیماریوں، پریشانیوں، طبعی عوارض و مشاغل، نیز بے چارگی و بے بسی کے احساس سے بھرپور ”بڑھاپا“ ان کا منتظر ہو۔

☆..... آیت کے آخری حصہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے انسان کو اپنے والدین کیلئے دعائے خیر کرتے رہنے کا تاکید بھی دیا گیا ہے، اور خالق ارض و سماء کی نظر میں والدین کا مقام و مرتبہ ملاحظہ ہو کہ انسان کو اپنے والدین کیلئے دعاء کا مضمون بلکہ الفاظ بھی خود اللہ کی طرف سے سکھادیئے گئے..... سبحان اللہ.....!!

اس دعاء میں خاص طور پر کَمَارَ رَبَّیَّ اِنِّی صَغِيرٌ سے اس طرف اشارہ اور تنبیہ مقصود ہے کہ انسان اپنے والدین کیلئے دعاء کرتے وقت چشم تصور سے ذرہ اپنے بچپن کے دور میں جھانک کر دیکھے، اور اُس وقت کو یاد کرے جب وہ انتہائی لاچار اور کمزور و بے بس تھا، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے بلکہ فطری حوائج و ضروریات اور نجاستوں و غلاظتوں سے صفائی و دھلائی کے معاملات میں بھی والدین کا محتاج و دستِ نگر تھا، مگر اس کے باوجود اس کے والدین کس طرح ہنسی خوشی اس کی پرورش کرتے رہے، اس کی راحت و آرام کی خاطر خود بے آرام رہے، اس کی خوشی اور دلجوئی کی خاطر ہر مشکل اور ہر تکلیف کو گلے لگایا، ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کی ناز برداریوں مگن رہے، ہر دم اور ہر آن اس پر دل و جان سے فریفتہ و قربان

ہوتے رہے..... اور جب کبھی وہ بیمار پڑ جاتا تو وہ رات بھر اس کے سر ہانے کھڑے رہتے اور اُف تک نہ کرتے، صبح ہونے پر جب وہ مسکرا کر انہیں دیکھ لیتا تو وہ اس کی بس ایک مسکراہٹ کی وجہ سے اپنی رات بھر کی تمام مشقت و تھکاوٹ اور تکلیف و پریشانی کو یکسر بھلا دیتے اور اپنی بھیگی پلکوں کے ساتھ ہزار ہا بار اللہ کا شکر بجالاتے..... یقیناً ہر انسان کے بچپن میں ایسی کتنی ہی راتیں آتی ہیں.....!!

اس آیت میں خالق کائنات کی طرف سے انسان کو اپنے والدین کیلئے دعا کرتے وقت خصوصاً بچپن کے اس دور کو یاد کرنے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے، تاکہ انسان کے لبوں پر جب یہ دعا آئے تو الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلیں..... کیونکہ ”بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے.....!“

☆..... قرآن کریم میں جس طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت و بندگی کے حکم کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے، اسی طرح والدین کی شکر گزاری و احسان مندی کو بھی اللہ کی شکر گزاری و احسان مندی کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾ (۱) ترجمہ: (تو میرا بھی شکر گزار بن اور اپنے والدین کا بھی شکر گزار بنارہ، آخر تجھے میری ہی طرف لوٹنا ہے) (۲)

اس سلسلہ میں قرآنی تعلیمات و ربانی ارشادات و توجیہات کے بعد رسول اللہ ﷺ کی چند احادیث مبارکہ بھی ملاحظہ ہوں:

☆ عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال: سألتُ رسولَ الله ﷺ:

(۱) لقمان [۱۴]

(۲) یعنی اگر اللہ کے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو اللہ کی طرف سے مؤاخذہ و محاسبہ سے بھاگ کر آخر کہاں جائیگا؟

أَيُّ الْأَعْمَالِ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ عَلَى وَاقْتِهَا، قُلْتُ ثُمَّ أَيُّ؟ قَالَ: بِرُ الْوَالِدَيْنِ، قُلْتُ ثُمَّ أَيُّ؟ قَالَ: الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (۱)

ترجمہ: (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”نماز اپنے وقت پر ادا کرنا“۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا: ”والدین کے ساتھ حسن سلوک“۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: ”اللہ کی راہ میں جہاد“۔

☆ عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما قال: جاء رجلٌ إلى النبي ﷺ فاستأذنه في الجهاد، فقال: أَحْيٍ وَالدَّاءُ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ (۲) ترجمہ: (حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا: ”کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟“ اس نے عرض کیا کہ: ”جی“۔ آپ نے فرمایا: ”تم انہی میں جہاد کرو“۔

یعنی اپنے والدین کی خدمت و نگہداشت اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں مشغول رہو، تمہارے لئے یہی جہاد ہے۔

☆ عن أنس رضي الله عنه قال: أتى رجلٌ رسولَ الله ﷺ فقال: إِنِّي أَشْتَهِي الْجِهَادَ وَلَا أَقْدِرُ عَلَيْهِ، قَالَ: هَلْ بَقِيَ مِنْ وَالدَيْكَ أَحَدٌ؟ قَالَ: أُمِّي، قَالَ: قَابِلِ اللَّهَ فِي بَرِّهَا، فَإِذَا فَعَلْتَ ذَلِكَ فَأَنْتَ حَاجٌّ وَمُعْتَمِرٌ وَمُجَاهِدٌ (۳)

(۱) بخاری [۵۹۷۰] کتاب الأدب۔ (۲) بخاری [۲۸۴۳] کتاب الجہاد والسیر، باب الجہاد باذن الوالدین۔ (۳) الطبرانی فی الصغیر والواسط۔

ترجمہ: (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: ”میں جہاد میں شرکت کی تمنا رکھتا ہوں، لیکن میں اس پر قادر نہیں ہوں۔“ آپؐ نے دریافت فرمایا: ”کیا تمہارے والدین میں سے کوئی حیات ہے؟“ اس نے عرض کیا کہ: ”جی! میری والدہ حیات ہیں۔“ آپؐ نے فرمایا: ”تم اللہ کے سامنے پیش ہونا ماں کے ساتھ اچھا سلوک لئے ہوئے [یعنی ماں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے رہو] اگر تم نے ایسا ہی کیا تو تم نے حج بھی کر لیا، عمرہ بھی کر لیا اور جہاد بھی کر لیا۔“

یعنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک میں ہی تمہارے لئے حج و عمرہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا اجر و ثواب ہے۔

☆ عن طلحة بن معاوية السلمي رضي الله عنه قال : أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ! إِنِّي أُرِيدُ الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ، قَالَ : أُمُّكَ حَيَّةٌ ؟ قُلْتُ : نَعَمْ ، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : الزَّمِ رَجُلَهَا فَتَمَّ الْجَنَّةُ (۱) ترجمہ: (حضرت طلحہ بن معاویہ السلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: ”اے اللہ کے رسول! میں جہاد میں شرکت کا خواہشمند ہوں،“ آپؐ نے فرمایا: ”کیا تمہاری ماں زندہ ہیں؟“ میں نے عرض کیا کہ: ”جی۔“ تب آپؐ نے فرمایا: ”تم ان کے قدموں کو تھامے رکھو، کیونکہ جنت وہیں ہے۔“

☆ عن أبي أمامة رضي الله عنه أَنَّ رَجُلًا قَالَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ! مَا حَقُّ الْوَالِدَيْنِ عَلَيَّ وَلَدِهِمَا ؟ قَالَ : هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ (۲)



ترجمہ: (حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ”والدین کا اپنی اولاد پر کیا حق ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”وہ دونوں تمہارے لئے جنت ہیں اور وہی دونوں ہی تمہارے لئے دوزخ ہیں۔“  
یعنی انسان کیلئے اس کے والدین کی خوشی جنت میں داخلے کا ذریعہ ہے، جبکہ اس کے برعکس ان کی ناراضگی دوزخ میں داخلے کا ذریعہ ہے۔

☆ عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال : رَغِمَ أَنْفُهُ ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُهُ ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُهُ ، قِيلَ : مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قال : مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَوْ أَحَدَهُمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ (۱)

ترجمہ: (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نامراد ہو، پھر نامراد ہو، پھر نامراد ہو“۔ عرض کیا گیا کہ: ”یا رسول اللہ! کون نامراد ہو؟“۔ فرمایا کہ: ”جس نے اپنے والدین کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر بھی [انہیں خوش کر کے] جنت میں داخل نہ ہو سکا۔“

☆ عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما قال : قال رسول الله ﷺ :

رِضَا اللَّهِ فِي رِضَا الْوَالِدِ ، وَ سَخَطُ اللَّهِ فِي سَخَطِ الْوَالِدِ (۳)

ترجمہ: (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی رضا والد کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔“

☆ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بدولت ”فرمانبردار“ اولاد نصیب ہوگی:

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال : قال رسول الله ﷺ : بَرُّوا آبَاءَكُمْ

تَبَرُّكُم أَبْنَاؤُكُمْ) (۱) ترجمہ: (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، تمہاری اولاد تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے گی۔“)

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں اس انتہائی نازک اور اہم ترین بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر کوئی انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی اپنی اولاد فرمانبردار اور نیک بخت ہو تو اس کیلئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ خود بھی اپنے والدین کا خدمت گزار اور فرمانبردار بن کر رہے، کیونکہ قانونِ قدرت یہی ہے..... جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے ضرور.....!!

☆ والدین کے ساتھ حسن سلوک ”درازی عمر“ اور ”وسعت رزق“ کا ذریعہ ہے:

عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يَمُدَّ لَهُ فِي عُمْرِهِ وَيُزَادَ فِي رِزْقِهِ فَلْيَبَرَّ وَالِدَيْهِ وَلْيَصِلْ رَحِمَهُ (۲)  
ترجمہ: (حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی کی یہ خواہش ہو کہ اس کی عمر طویل ہو اور اس کے رزق میں فراوانی ہو، اسے چاہئے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک، اور رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔“)

☆ والدین کے انتقال کے بعد ان کیلئے دعاء:

انسان پر اس کے والدین کے بیشمار احسانات کی وجہ سے انسانیت و مروت اور وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ادب و احترام کا یہ سلسلہ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا یہ معاملہ محض

(۱) الترغیب والترہیب (بحوالہ حاکم فی المستدرک) الترہیب أن يعتذر إلى المرء أخوه فلا يقبل عذره نیز: الطبرانی فی الأوسط۔ البیہ بعض اہل علم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ (۲) احمد [۱۳۴۲۵] [۱۳۸۳۸]

ان کی دنیاوی زندگی تک ہی محدود نہ رہے، بلکہ یہ سلسلہ ان کے انتقال کے بعد بھی قائم و دائم اور جاری و ساری رہے اور انسان اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اپنے والدین کو یاد رکھے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث میں اس چیز کی تاکید و تلقین کی گئی ہے:

☆ عن أبي أسيد مالك بن ربيعة الساعدي رضي الله عنه قال : بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِذْ جَاءَ رَجُلٌ مِنْ بَنِي سَلَمَةَ ، فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ! هَلْ بَقِيَ مِنْ بَرِّ آبَائِي شَيْءٌ أَبْرُهُمَا بَعْدَ وَفَاتِهِمَا ؟ قَالَ : نَعَمْ ! الصَّلَاةُ عَلَيْهِمَا ، وَالْإِسْتِغْفَارُ لَهُمَا ، وَانْفَاضُ عَهْدِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا ، وَالْإِكْرَامُ صَدِيقَهُمَا ، وَصَلَةُ الرَّحِمِ الَّتِي لَا تُوصَلُ إِلَّا بِهِمَا (۱) ترجمہ: (حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ اس دوران بنو سلمہ سے تعلق رکھنے والا ایک شخص وہاں وارد ہوا اور عرض کیا کہ: ”اے اللہ کے رسول! کیا میرے والدین کے انتقال کے بعد بھی میرے ذمے ان کا کوئی حق باقی ہے؟“ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ”ہاں! تم ان کیلئے دعاء کرتے رہنا (۲) ان کیلئے اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہنا، انہوں نے جس کسی کے ساتھ جو کوئی عہد و پیمان کر رکھا ہو اسے ان کے بعد نبھاتے رہنا، ان کے دوستوں کی عزت کرنا اور اس رشتے کو جوڑے رکھنا جو ان کے ذریعے جڑا ہوا تھا۔“

☆ عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : ( تَرْفَعُ لِلْمَيِّتِ دَرَجَتَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ فَيَقُولُ : أَيُّ رَبِّ ! أَيُّ شَيْءٍ هَذِهِ ؟ فَيُقَالُ : وَلَدُكَ

(۱) ابن حبان [۴۱۸] ابن ماجہ [۳۶۶۴] ابوداؤد [۵۱۴۲] احمد [۱۶۱۰۳] البیہقی مختلف روایات میں الفاظ قدرے مختلف ہیں۔ (۲) اس حدیث میں ”الصلاة“ سے مراد مطلق دعاء بھی ہو سکتی ہے، نیز اس سے ”نماز جنازہ“ بھی مراد لی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ بھی درحقیقت میت کیلئے دعاء ہی ہے۔

إِسْتَغْفَرَ لَكَ (۱) ترجمہ: (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کسی میت کے درجات میں بعض اوقات اس کی موت کے بعد ترقی و اضافہ کیا جاتا ہے، تب وہ [تعجب و حیرت سے] پوچھتا ہے کہ: اے میرے رب! یہ کیا معاملہ ہے؟ اسے [اللہ کی طرف سے] جواب دیا جاتا ہے کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لئے استغفار کیا ہے۔)

☆ عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ (۲) ترجمہ: (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب ابن آدم کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کیلئے عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے: اس نے کوئی صدقہ جاریہ چھوڑا ہو، یا ایسا علم چھوڑا ہو جو اس کے بعد بھی [خلق خدا کیلئے] نافع و مفید ہو، یا ایسی اولاد چھوڑا ہو جو اس کیلئے دعائے خیر کرتی رہے) (۳)

☆ والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے:

خالقِ ارض و سماء کے فیصلے کے مطابق جس طرح صرف اُس ایک اللہ کی عبادت و بندگی کے بعد سب سے بڑی نیکی والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، بعینہ اسی طرح اللہ کے ساتھ شرک جیسے بدترین جرم اور ناقابلِ معافی گناہ کے بعد سب سے بڑا جرم اور بدترین گناہ والدین کی نافرمانی اور ان کے ساتھ بدسلوکی ہے۔

(۱) بخاری فی الادب المفرد [۳۶] باب بر الوالدین بعد موتہما۔

(۲) مسلم [۱۶۳۱] نیز بخاری فی الادب المفرد [۳۸] باب بر الوالدین بعد موتہما۔

(۳) اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ والدین کے انتقال کے بعد ان کیلئے دعائے خیر کا اہتمام و التزام کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ملاحظہ ہو: (أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِكَبَرِ الْكَبَائِرِ؟ أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِكَبَرِ الْكَبَائِرِ؟ أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِكَبَرِ الْكَبَائِرِ؟ قُلْنَا بَلَىٰ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: إِلَّا شَرَّكَ بِاللَّهِ، وَ عُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ) (۱) ترجمہ: (کیا میں تمہیں نہ بتا دوں کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ کیا میں تمہیں نہ بتا دوں کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی۔“

☆ والدین کی نافرمانی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (كُلُّ الذُّنُوبِ يُؤَخِّرُ اللَّهُ مِنْهَا مَا شَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا عُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ، فَإِنَّهُ يُعَجِّلُهُ لِصَاحِبِهِ فِي الْحَيَاةِ قَبْلَ الْمَمَاتِ) (۲) ترجمہ: (تمام گناہوں میں سے اللہ جس گناہ کی سزا کو چاہے گا قیامت تک مؤخر کر دے گا، سوائے والدین کی نافرمانی کے، کہ ایسے شخص کو اللہ اس کی موت سے قبل دنیا میں بھی سزا دے گا۔)

عدل و انصاف فقط حشر تک نہیں موقوف زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

☆ کافر و مشرک والدین کے ساتھ بھی حسن سلوک ضروری ہے:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾ (۳) ترجمہ: (اور اگر وہ تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ تو شریک ٹھہرائے میرے ساتھ کسی کو بغیر کسی دلیل کے، تو ان کا کہنا

(۱) بخاری [۵۹۷۶] باب: عقوق الوالدین من الکبائر۔

(۲) بخاری فی الأدب المفرد [۵۹۱] باب النبی۔

(۳) لقمان [۱۵]



نے فرمایا: ”تمہاری ماں کا“ اس نے پوچھا: اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: ”تمہاری ماں کا“ اس نے پوچھا: اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: ”تمہارے باپ کا“۔

اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اس کی تمام تعلیمات آفاقی ہیں، اسی لئے یہ تمام تعلیمات انسانوں کے فطری جذبات و احساسات اور ان کی بشری ضروریات کے عین مطابق ہیں، لہذا خالق کائنات کی طرف سے ”باپ“ کی نسبت ”ماں“ کے حق کو مقدم رکھنا، نیز اُس کے ساتھ حسن سلوک کی زیادہ تاکید درحقیقت انسانی فطرت اور انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ:

☆..... اولاد کے وجود اور پھر اس کی بقاء کے معاملے میں بہت سے مراحل ایسے آتے ہیں جن میں باپ کی نسبت ماں بہت زیادہ تکلیف اٹھاتی ہے، مثلاً حمل، ولادت، اور رضاعت وغیرہ ایسے مراحل ہیں کہ جن میں باپ کی شرکت کے بغیر تہا ماں ہی تمام تر مشقت و صعوبت برداشت کرتی ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

﴿وَصَيَّنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفَصَّالَهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾ (۱) ترجمہ: (ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے، اس کی ماں نے اسے [دورانِ حمل] اٹھائے رکھا کمزوری پر کمزوری کے ساتھ، اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے، کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکرگذاری کر، آخر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے)

نیز ارشاد باری ہے: ﴿وَصَيَّنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا

وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفَصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ﴿۱﴾ ترجمہ: (ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے [دورانِ حمل] تکلیف جھیل کر اسے اٹھائے رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنا، اس کے حمل کا اور اس کے دودھ پھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے)

☆..... گزشتہ مراحل یعنی حمل، ولادت اور پھر رضاعت کے دوران تنہا تکلیف و مشقت اٹھانے کے بعد اب آگے اولاد کی تربیت کے مرحلے میں اگرچہ باپ بھی یقیناً بہت محنت و مشقت کرتا ہے اور بڑی تگ و دو میں مشغول رہتا ہے، تاہم اس موقع پر بھی ماں ہی براہِ راست متاثر ہوتی ہے اور اولاد کی خاطر ہمہ وقت نڈھال اور ہلکان رہتی ہے۔

☆..... ”ماں“ چونکہ عورت ہونے کی وجہ سے فطری طور پر ہی کمزور مخلوق ہے اس لئے اس کے جذبات و احساسات بھی انتہائی نازک اور کمزور ہوا کرتے ہیں، لہذا اس کے ساتھ حسن سلوک کی خاص طور پر تاکید کی گئی، اور خالق کائنات کی طرف سے اولاد کو یہ تنبیہ کر دی گئی کہ تمہاری ماں اگرچہ بظاہر کمزور اور بے بس ہے، تمہاری طرف سے کسی دل آزاری پر وہ بے چاری کمزور اور ممتا کی ماری ہوئی ماں محض آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی..... مگر اس بات کو خوب یاد رکھو کہ تمہیں کمزور و بے بس نظر آنے والی تمہاری اس ماں کا خالق کائنات کے نزدیک بڑا رتبہ و مقام ہے اور اس نے تمہارے لئے جنت اسی ”ماں“ کے قدموں تلے رکھ دی ہے..... لہذا اگر جہنم کی آگ سے بچنے اور جنت کی ابدی و دائمی نعمتیں حاصل کرنے کی رغبت اور تمنا ہے تو ماں کو خوش کر لو اور اس کی دل آزاری سے باز آ جاؤ، ورنہ حسرت و ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا.....!!



☆..... ”ماں“ کو چونکہ اپنی اولاد سے بے پناہ محبت ہوا کرتی ہے جس میں ”ہوش و حواس“ کی بجائے عام طور پر ”جوش اور جذبات“ کا عنصر نمایاں اور غالب ہوتا ہے، اس لئے اکثر و بیشتر ماں اپنی اولاد کی طرف سے کوئی بے ادبی و گستاخی سرزد ہو جانے کے باوجود صبر و تحمل اور درگزر سے کام لیتی ہے اور اولاد کی طرف سے نامناسب رویہ و سلوک کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے..... اس لئے اولاد پر باپ کی نسبت ماں کا حق زیادہ اور مقدم رکھا گیا اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید و تلقین کی گئی، تاکہ اس کی بے پناہ محبت و شفقت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اولاد اس کے مقام و مرتبہ کو فراموش کرنے یا نظر انداز کر دینے سے باز رہے۔

### ☆ ایک اہم حقیقت:

والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی خدمت و اطاعت اور ان کی قدر دانی کے بارے میں آخر میں ایک یہ اہم ترین حقیقت بھی ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ دنیا میں والدین کے سوا باقی ہر رشتہ ایسا ہے جو ایک سے زائد بار نصیب ہو سکتا ہے، مثلاً بھائی بہن ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں، اولاد بہت سی ہو سکتی ہے، حتیٰ کہ شوہر اور بیوی میں سے کسی کے انتقال یا طلاق کی وجہ سے جدائی کی صورت میں اگر کسی کو دوبارہ گھر بسانے کی رغبت ہو تو یہ رشتہ بھی ایک سے زائد بار وجود میں آ سکتا ہے، نیا شوہر بھی مل سکتا ہے اور نئی بیوی بھی.....!

لیکن صرف ”ماں باپ“ کا رشتہ ایسا نازک، اس قدر قیمتی اور نامول رشتہ ہے کہ جس کا کوئی بدل ممکن نہیں ہے، انسان کو اپنی پوری زندگی میں پیدائش سے موت تک صرف اور صرف ایک ہی بار ”ماں باپ“ نصیب ہوتے ہیں، کسی کی دوائیں نہیں ہو سکتیں، یاد و باپ نہیں ہو سکتے۔

لہذا جب تک اس کے ماں باپ زندہ ہیں اسے چاہئے کہ اس عظیم رشتے اور اس انمول نعمت کی قدر پہچانے، اور اپنے لئے دنیا و آخرت میں سعادت مندی کا سامان کر لے، ورنہ ایک روز جب وہ اس فانی دنیا سے کوچ کر جائیں گے تو پھر ان کی شکل دوبارہ کبھی نظر نہ آ سکے گی اور پھر زندگی بھر انسان کی آنکھیں ان کے دیدار کیلئے بس ترستی ہی رہیں گی..... اور تب انسان بس یہ سوچتا ہی رہ جائے گا کہ کہاں چلے گئے میرے وہ والدین جنہوں نے مجھے پالا، جنہوں نے مجھے لکھایا پڑھایا، جو میری راحت کی خاطر خود ہمیشہ بے آرام رہے، جو مجھے زمانے کی سختیوں سے بچانے کیلئے میرے سر پر سائبان بنے رہے، اور جو میری سلامتی کی خاطر دعائے نیم شب میں آنسو بہاتے رہے.....!!



## ”اولاد: آنکھوں کی ٹھنڈک“

مگر کس طرح.....؟

قرآن کریم میں سورہ الفرقان کی آخری چند آیات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے مومن بندوں کی چند صفات و علامات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾ (۱) ترجمہ (اور وہ [اہل ایمان] کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو عطا فرما ہمیں شریک حیات اور اولاد جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا)

اس آیت کے معنی اور مفہوم میں اگر غور و فکر کیا جائے تو اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

☆ پہلی بات یہ کہ:

انسان کیلئے اس کے بیوی بچے یا اگر عورت ہے تو اس کیلئے اس کا شوہر اور اولاد یقیناً اللہ کی طرف سے بہت بڑی نعمت اور رحمت ہیں، اور یہ چیزیں اس قابل ہیں کہ انسان ان کی طلب اور خواہش رکھے اور اللہ سے ان چیزوں کے حصول کیلئے دعاء و فریاد اور آہ و زاری کرے، جیسا کہ اس آیت میں اہل ایمان کی صفات کے ضمن میں ان کی ایک یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے اولاد طلب کرتے ہیں۔ اور پھر قرآن کریم میں ان کی اس دعاء کے تذکرہ سے تمام مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو یہی بات سمجھانا مقصود ہے کہ یقیناً اولاد ایسی نعمت ہے جس کے حصول کیلئے انسان کو اللہ سے اسی طرح دعاء و فریاد کرنی

چاہئے۔

☆ دوسری بات یہ کہ:

انسان کو یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ یقیناً بیوی بچے اور اسی طرح عورت کیلئے اس کا شوہر اور اولاد بہت بڑی نعمت تو ہے، مگر ضروری نہیں کہ یہ تمام رشتے ہر انسان کیلئے ہمیشہ نعمت ہی ہوں۔ بلکہ بعض اوقات یہی رشتے انسان کیلئے رحمت کی بجائے زحمت، عذاب اور وبالِ جان بھی بن جایا کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ رشتے ہمیشہ نعمت ہی ہوتے تو پھر قرآن کریم میں اللہ کی طرف سے اس دعاء کے تذکرہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جس میں ایسے شریکِ حیات نیز ایسی اولاد کی طلب کی تعلیم دی گئی ہے جو انسان کیلئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اور پھر یہی بات قرآن کریم میں مذکور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعاء سے بھی واضح ہے: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اے میرے رب! مجھے صالح اولاد عطا فرما)

نیز حضرت زکریا علیہ السلام کی اس دعاء سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ (۲) ترجمہ: (اے میرے رب! تو اپنے خاص فضل و کرم سے مجھے ایسی اولاد عطا فرما جو پاکیزہ ہو)

یعنی اولاد ایسی نعمت ہے جس کے حصول کیلئے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام جیسی عظیم ترین اور انتہائی جلیل القدر اور برگزیدہ ہستیوں نے بھی اللہ سے دعاء و فریاد کی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ان دونوں مذکورہ دعاؤں سے یہ بات بھی خوب واضح اور عیاں ہے کہ انسان کیلئے اولاد یقیناً بہت بڑی نعمت تو ہے..... مگر بشرطیکہ وہ صالح اور پاکیزہ ہو، عمدہ

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۴۴) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

اور شریفانہ اخلاق و کردار کی حامل ہو، اللہ اور رسول ﷺ کی بھی مطیع و فرمانبردار ہو اور اپنے والدین کی بھی مطیع و فرمانبردار ہو، یقیناً صرف ایسی اولاد ہی انسان کیلئے نعمت اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتی ہے۔ ورنہ انسان کو یہ تلخ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ اس کے اپنے بیوی بچے نیز عورت کیلئے اس کا اپنا ہی شوہر اور اولاد اگر مصیبت اور عذاب جان بن جائے تو یہ چیز انتہائی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہوا کرتی ہے، کیونکہ کسی غیر سے اگر کوئی رنجش یا ناراضگی ہو جائے یا اس سے کوئی تکلیف و صدمہ پہنچے تو انسان حسب مصلحت اس سے دوری و علیحدگی بھی اختیار کر سکتا ہے، لیکن اگر کسی کے ساتھ اس کی اپنی اولاد کا ہی رویہ و سلوک بُرا اور تکلیف دہ ہو، تو یقیناً اس کی اپنی اولاد ہی اس کیلئے مصیبت و عذاب بن جائیگی۔

اور پھر یہ معاملہ اس لئے بھی انتہائی نازک اور حساس ترین ہے کہ کوئی غیر اگر کسی کے ساتھ دشمنی یا بدتمیزی کرتا ہے تو وہ تو اس کے گھر سے باہر ہے، جبکہ اپنی ہی اولاد میں سے اگر کوئی بد اخلاق یا بدتمیز اور بد کردار ہے تو وہ تو خود اس کے اپنے گھر کے اندر ہے، یعنی یہ دشمن تو خود انسان کے اپنے ہی گھر کے اندر پل رہا ہے، رات دن اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے ہے، اسی کی محنت کی کمائی میں سے کھا تا پیتا ہے، عیش کرتا ہے، اور پھر اسی کا دل دکھاتا ہے اور اسے رلاتا ہے، انسان اس سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتا، قدرت کے بنائے ہوئے اس اٹل اور مضبوط رشتے کو توڑ بھی نہیں سکتا، اسے اپنے گھر سے نکال بھی نہیں سکتا، بس رات دن اپنی غمزدہ آنکھوں سے حیران و پریشان اس کی بُری حرکتوں کا نظارہ کرتا ہے، اس کی بد اخلاقیات اور بدتمیزیاں برداشت کرتا ہے، اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اس کی خون پسینی کی کمائی کو اس کی یہ نافرمان اولاد کس طرح برباد کر رہی ہے، جس اولاد کی خاطر زندگی

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۴۵) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

بھرا انسان محنت و مشقت کرتا رہا اور جس کی راحت و آرام کی خاطر انسان نے زندگی بھر خود کو بے آرام رکھا اور اپنی تمام خواہشات کا گلا دبائے رکھا..... یہی اولاد اگر عذاب بن جائے تو کسی بھی انسان کیلئے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا ہے.....؟

☆ اب سوال یہ ہے کہ:

اس انتہائی تکلیف دہ اور عظیم ترین صدمہ سے بچنے کیلئے انسان کیا کر سکتا ہے؟  
☆ اس اہم ترین اور انتہائی نازک سوال کا جواب اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ ہے کہ اس مقصد کیلئے درج ذیل اسباب کو اختیار کیا جائے:

(۱) اولاد کیلئے دعائے خیر:

انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صلاح و فلاح اور دنیا و آخرت میں بہتری اور ترقی و کامیابی کیلئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے خوب گڑا گڑا کر اور عاجزی و انکساری کے ساتھ دعاء و فریاد کرتا رہے، چنانچہ اس سلسلہ میں مناسب ترین دعاء تو یہی ہے جس کا تذکرہ اس مضمون کی ابتداء میں کیا گیا اور جو کہ سورہ الفرقان کی آیت نمبر ۷ میں موجود ہے، وہاں سے یاد کی جاسکتی ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ سورہ احقاف کی آیت نمبر: ۱۵ میں مذکور اس دعاء کا بھی اہتمام و التزام کرنا چاہئے: ﴿رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَاٰلِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (۲) ترجمہ: (اے میرے رب! تو مجھے اس بات کی توفیق عطاء

(۱) رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان: ۷۴)

(۲) احقاف [۱۵]

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۴۶) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے، اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو خوش ہو جائے، اور تو میری اولاد کو بھی صالح بنا، میں تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

## (۲) اولاد کی اخلاقی و روحانی تربیت:

والدین جس طرح اپنی اولاد کی دنیاوی ترقی و آرام اور ان کی کامیابی اور باعزت زندگی کیلئے خوب محنت و کوشش کرتے ہیں اور تمام ممکن اسباب و وسائل اختیار کرتے ہیں..... اولاد کی اخلاقی و روحانی تربیت و ترقی کیلئے بھی انہیں اسی طرح فکر مند ہونا چاہئے اور ہر ممکن سعی و کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ انسان صرف گوشت پوست کے اس جثہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل چیز اس کی انسانیت و روحانیت اور اس کا اخلاق و کردار ہے، لہذا اس کے اخلاق و کردار کی تعمیر کی طرف توجہ دینا اور اس مقصد کی خاطر زیادہ محنت و جستجو کرنا یقیناً زیادہ اہم اور ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ) (۱) ترجمہ: (تم میں سے ہر کوئی نگہبان ہے اور تم میں سے ہر کوئی اپنی رعیت کے بارے میں [اللہ کے سامنے] جواب دہ ہے)۔

لہذا اگر کسی کے دل میں یہ خواہش اور تمنا ہو کہ اس کی اولاد اس کیلئے مصیبت و عذاب بننے کی بجائے نعمت و رحمت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہو تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کیلئے دنیاوی ترقی و کامیابی کیلئے محنت و کوشش اور ضروری انتظام کے ساتھ ساتھ اولاد کی اصلاح باطن کی بھی فکر کرے اور ایسی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے جس کی بدولت اولاد کے

(۱) بخاری، باب: الحجۃ فی القرۃ والمدن [۸۵۳] نیز: باب اذا آتاه خادمہ بطعامہ [۲۴۱۹] نیز: باب قوا أنفسکم والیکم ناراً [۴۸۹۲] نیز: کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اَطِيعُوا اللہَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولٰٓئِکُمْ مَرْکُم [۶۷۱۹]

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۴۷) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

دل میں فکرِ آخرت، اللہ کا خوف، دنیا کی فنایت، موت کے بعد آنے والے مرحلے کیلئے تیاری کی جستجو، روزِ قیامت اللہ کی عدالت میں حاضری، اپنے ہر قول و فعل کی جواب دہی، اللہ کے سامنے حساب و کتاب اور جزا و سزا کی فکر اور تیاری کا جذبہ بیدار ہو۔

نیز یہ کہ آج اگر ہم اپنے بچوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم سے آراستہ کرینگے تب ہی تو انہیں اس بات کا علم ہوگا کہ قرآن میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہے کہ: ﴿إِنَّمَا يَبْلُغَنَّ عَنْكَ الْكِبَرُ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَقْ﴾ (۱) ترجمہ: (جب تمہاری نظروں کے سامنے ان دونوں [یعنی تمہارے والدین] میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں ہی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے تو اب تم ان کے سامنے ”اُف“ بھی نہ کہو)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (تُرْفَعُ لِلْمَيِّتِ بَعْدَ مَوْتِهِ دَرَجَتُهُ فَيَقُولُ: أَيُّ رَبِّ أَيُّ شَيْءٍ هَذِهِ؟ فَيَقَالُ: وَلَئِكَ اسْتَغْفَرَ لَكَ) (۲) ترجمہ: (کسی انسان کے مرنے کے بعد [بعض اوقات] اس کے درجات بلند کئے جاتے ہیں، جس پر وہ حیران ہو کر [اللہ سے] پوچھتا ہے کہ: اے میرے رب! یہ کیا معاملہ ہے؟ اسے [اللہ کی طرف سے] جواب دیا جاتا ہے کہ اس وقت تمہاری اولاد تمہارے لئے دعا و استغفار میں مشغول ہے)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ) (۳) ترجمہ: (جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کیلئے عمل کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے: صدقہ جاریہ (۴) یا ایسا علم جس سے [اس کی موت کے بعد بھی] فائدہ اٹھایا جا

(۱) الاسراء/ بنی اسرائیل [۲۳] (۲) بخاری فی الأدب المفرد [۳۶] باب بر الوالدین بعد موتہما۔

(۳) مسلم [۱۶۳۱] باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته۔ (۴) ”صدقہ جاریہ“ سے مراد یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام کیا ہو جس سے خلقِ خدا اس کی موت کے بعد بھی مستفید ہو رہی ہو۔



رہا ہو، یا ایسی اولاد جو اس کیلئے [اس کی موت کے بعد بھی] دعائے خیر کرتی رہے۔  
لہذا اپنی اولاد کی اخلاقی و دینی تعلیم و تربیت کے بعد ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جب تک ہم اس دنیا میں زندہ رہیں گے اس وقت تک ہماری اولاد ہمارے سامنے کبھی ”اُف“ تک نہیں کہے گی، اور جب اللہ کی مرضی اور اس کے حکم سے ہم اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تب ان شاء اللہ ہماری اولاد ہمارے لئے دعائے خیر اور استغفار کرتی رہے گی، اور یوں ان شاء اللہ ہماری اولاد ہمارے لئے زندگی میں بھی اور ہمارے انتقال کے بعد بھی رحمت، نعمت، اور آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوگی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اولاد کی اخلاقی و روحانی تربیت و اصلاح کی طرف توجہ اور کوشش کا اہتمام و انتظام بچپن سے ہی ہونا چاہئے، کیونکہ جس طرح درخت جب چھوٹا ہوتا ہے تو اس کی شاخوں کو اپنی مرضی کے مطابق موڑا جاسکتا ہے اور یوں اس درخت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بنایا اور ڈھالا جاسکتا ہے، لیکن وہی درخت جب بڑا اور مضبوط ہو جائے تو اب یہ ممکن نہیں ہوگا، اب اس کی شاخیں ٹوٹ تو سکتی ہیں لیکن انہیں اپنی مرضی کے مطابق موڑا نہیں جاسکتا، اور نہ اب اس درخت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کوئی شکل دی جاسکتی ہے۔

بعینہ اسی طرح بچے کو ہم زندگی بھر کیلئے جس شکل اور جس انداز میں نیز جن عادات و اطوار کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں ہمیں اس کے بچپن میں ہی اسے وہی شکل دے دینی چاہئے اور انہی طور طریقوں کا عادی بنا دینا چاہئے، ورنہ بڑے ہونے کے بعد یہ کام ممکن نہیں ہوگا اور ہماری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی اور ہمارا خواب کسی صورت شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا اور بس پھر ہمیشہ کیلئے حسرت ہی رہ جائے گی..... اور تب ہماری اپنی ہی یہ اولاد ہمیں بیگانی

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۴۹) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

محسوس ہوگی، اور ہم صاحبِ اولاد ہوتے ہوئے بھی خدا نخواستہ خود کو بے اولاد سمجھنے پر مجبور ہوں گے.....!!

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: (مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ لَسَبْعٍ) (۱)  
ترجمہ: (اپنی اولاد کو سات سال کی عمر سے ہی نماز کا حکم دو)

یعنی اولاد کو بچپن میں ہی نماز کا عادی بنا دیا جائے، اور اسی پر قیاس کرتے ہوئے ہم انہیں ہمیشہ کیلئے جس روپ میں دیکھنے کی خواہش رکھتے ہوں انہیں ان کے بچپن اور کم عمری میں ہی اس روپ میں ڈھال دیا جائے، کیونکہ بعد میں یہ ممکن نہیں ہوگا۔

### (۳) اولاد کے انجام کی فکر:

انسان ہمیشہ اپنی اولاد کی دنیاوی ترقی و کامیابی اور اس کے بہتر مستقبل کیلئے فکر مند اور کوشاں رہتا ہے، یقیناً یہ ایک طبعی امر ہے اور اگر یہ کوشش اور جدوجہد شرعی اصول و ضوابط کے مطابق ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بلکہ یہ تو خود شریعت اسلامیہ کی طرف سے ہی والدین کے ذمے ان کی اولاد کیلئے مقرر کردہ حقوق میں شامل ہے۔ البتہ یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہئے کہ دنیا کی زندگی عارضی و فانی ہے، جبکہ آخرت کی زندگی ابدی ہے، لہذا ظاہر ہے کہ آخرت کی کامیابی و راحت کی فکر زیادہ ہونی چاہئے اور اس مقصد کیلئے کوشش اور جدوجہد بھی زیادہ ہونی چاہئے، بہت سے لوگوں کو اکثر و بیشتر یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ ہمیں اس بات کی انتہائی فکر ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد بچوں کا کیا بنے گا؟ لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ خود بچوں کے مرنے کے بعد ان (بچوں) کا کیا بنے گا....؟ کیونکہ ہمارے بچے بھی تو آخر انسان ہی ہیں اور ہر انسان کی طرح یقیناً ان کی آخری منزل

بھی وہی ہے..... یعنی موت..... اور پھر اس کے بعد قبر کی تنہائی..... نیز یہ کہ جلد یا بدیر آخر کبھی نہ کبھی تو بچوں کیلئے بھی اس دنیائے فانی سے کوچ اور رخصتی کا وقت آ ہی جائے گا، اور اس وقت خواہ ان بچوں کی عمر کچھ بھی ہو، خواہ اس وقت یہ بوڑھے ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں، لیکن بہر حال ہوں گے تو یہ آخر ہمارے ہی بچے، اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(الْقَبْرِ رَوْضَةً مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةً مِنْ حُفْرِ النَّارِ) (۱) ترجمہ:

(قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے)

یعنی کسی کیلئے قبر جنت کا ایک حصہ ہوگی اور کسی کیلئے قبر ہی دوزخ ہوگی، ہمارے یہ معصوم اور پھول جیسے بچے اور یہ ہمارے جگر گوشے جن کے آرام و راحت کی خاطر آج ہم کس قدر فکر مند رہتے ہیں، اور خصوصاً یہ معصوم بچے دن بھر کھیل کود اور اپنی معصومانہ شرارتوں کے بعد رات کو جب اپنے چھوٹے سے تکیے پر سر رکھے ہوئے سو رہے ہوتے ہیں اس وقت کتنے پیارے لگتے ہیں اور ہمیں ان پر کس قدر پیارا رہا ہوتا ہے..... اس وقت ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ہمیں اچھا لگے یا بُرا لگے مگر یہ کہ یقیناً کبھی نہ کبھی وہ وقت بھی آ ہی جائیگا جب ہمارے یہی لختِ جگر اور یہ ہماری آنکھوں کے نور اور دل کے سرور اسی طرح اپنی قبر میں سو رہے ہوں گے..... نہ جانے وہ کون سی جگہ ہوگی اور کون سا شہر اور ملک ہوگا؟ اور اللہ ہی جانے وہ قبر ان کیلئے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوگی..... یا..... خدا نخواستہ..... بس آگے تو کچھ لکھتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے..... اللہ ہم سب پر رحم فرمائے، آمین۔

اور اسی جذبے کے تحت ہمیں اپنی اولاد کی اصلاح اور مناسب اخلاقی تربیت کیلئے فکر اور کوشش کرنی چاہئے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۵۱) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھٹھک“ مگر.....؟

أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ﴿۱﴾ ترجمہ: (اے ایمان والو! تم بچاؤ خود اپنے آپ کو بھی اور اپنے اہل و عیال کو بھی [جہنم کی] آگ سے)۔

### (۴) اولاد میں عدل و انصاف:

خالق کائنات نے اس تمام کائنات کی بنیاد ہی عدل و انصاف پر رکھی ہے، جہاں انصاف ہوگا وہاں ترقی اور ہر قسم کی خوبی و بہتری ہوگی، اور جہاں نا انصافی ہوگی یقیناً وہاں تباہی و بربادی آکر ہی رہے گی، لہذا عدل و انصاف کے تقاضوں کی مکمل پابندی تو ہمیشہ اور ہر معاملے میں ہی انتہائی ضروری ہے۔

البتہ اولاد کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں اس چیز کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، لہذا اس سلسلے میں والدین کیلئے عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کی مکمل رعایت و پاسداری از حد ضروری و لازمی ہے، کیونکہ والدین اگر اپنی ہی اولاد میں باہم عدل و انصاف کے تقاضوں کو پامال کرنے لگیں تو اس سے یقیناً ان میں احساسِ محرومی باہم نفرت و عداوت اور انتقام کے جذبات نشوونما پانے لگیں گے، نیز والدین کی عزت و احترام اور اطاعت گزاری و فرمانبرداری کی بجائے سرکشی و نافرمانی کا رجحان پیدا ہوگا..... جس سے گھر کا سکون و اطمینان برباد ہو جائے گا، نیز یہ چیز دنیا و آخرت میں ناکامی و نامرادی اور ذلت و رسوائی کا سبب بھی بنے گی۔ (۲)

### (۵) اپنی اصلاح کی فکر:

والدین اگر یہ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد ان کیلئے عذاب اور وبالِ جان بننے کی بجائے

(۱) التحريم [۶]

(۲) اس سلسلہ میں مزید تفصیل کیلئے ”عدل و انصاف“ کے باب میں صفحہ ۸۸-۸۹ بھی ملاحظہ ہو۔

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۵۲) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

نعمت، راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہو تو انہیں یہ اٹل حقیقت خوب ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ اس مقصد کیلئے انہیں سچے دل اور خلوص نیت کے ساتھ پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر و جستجو کرنا ہوگی۔

لہذا والدین کیلئے ضروری ہے کہ تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنا شیوہ و شعار بنائیں، دینی احکام، شرعی فرائض و واجبات اور اسلامی آداب و تعلیمات کی مکمل پابندی کریں، پاکیزہ سیرت و کردار، اعلیٰ خلاق اور عمدہ صفات سے اپنی شخصیت کو آراستہ و مزین کریں، ہر قسم کی برائی سے اپنا دامن بچائیں، اپنے قول و فعل میں مکمل مطابقت پیدا کریں، اولاد کو کسی خوبی کا حکم دینے سے قبل خود اس خوبی کو اپنائیں، انہیں کسی برائی سے باز رہنے کی تاکید و تلقین سے پہلے خود اس برائی سے دوری و کنارہ کشی اختیار کریں، یوں اپنی شخصیت کو اولاد کے سامنے اعلیٰ مثال اور قابل تقلید نمونہ بنا کر پیش کریں، ایسی شخصیت جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو..... اس کے بعد اولاد کی صلاح و فلاح کی توقع کریں، کیونکہ ”اصل“ کی درستی کے بغیر ”سائے“ کی درستی کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے.....؟

(۶) اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (بَرُّوْا اٰبَاءَكُمْ تَبَرُّكُمْ اٰبْنَاؤُكُمْ) (۱) ترجمہ: (تم اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، تاکہ تمہاری اولاد بھی تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے) اس حدیث کی رُو سے یہ بات خوب واضح ہے کہ آج ہم اپنے والدین کے ساتھ جس قسم کا سلوک رواد رکھیں گے کل ہماری اولاد بھی ہمارے ساتھ بعینہ وہی سلوک کرے گی۔

(۱) الترغیب والترہیب (بحوالہ حاکم فی المستدرک) الترہیب أن يعتذر إلى المرء أخوه فلا يقبل عذره۔

نیز: الطبرانی فی الاوسط۔ البدیع بعض اہل علم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

معاشرتی اخلاق و آداب (۲۵۳) اولاد: ”آنکھوں کی ٹھنڈک“ مگر.....؟

---

لہذا انسان کو یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ نے یہ معاملہ تو خود انسان ہی کے حوالے کر دیا ہے اور اسی کے اختیار میں یہ چیز دے دی ہے، اب اس کی مرضی ہے کہ وہ اپنے لئے کیا چیز پسند کرتا ہے، آج وہ خود جو کچھ اپنے والدین کے ساتھ کرے گا، کل وہی اس کے ساتھ بھی ہو جائے گا، قدرت کا قانون اٹل ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا، لہذا انسان کو اللہ سے ڈرنا چاہئے اور تصور کی آنکھ سے اس منظر کو دیکھنا چاہئے کہ جب وہ خود بوڑھا، کمزور اور محتاج ہو چکا ہوگا، اور اس وقت اس کی یہ دلی تمنا ہوگی کہ اس کی یہ اولاد جس کی خاطر اس نے زندگی بھر کلوہو کے بیل کی طرح محنت و مشقت کی، جس کا مستقبل سنوارنے کی خاطر اس نے اپنی کتنی ہی خواہشات اور آرزوؤں کا خون کیا، کاش آج یہ اولاد اس کے لئے سہارا بن سکے اور اس کے بڑھاپے کیلئے لالٹھی کا کام دے سکے.... اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی یہ آرزو پوری ہو اور اس کی اولاد اس کے بڑھاپے اور محتاجی و کمزوری کے وقت اس سے اپنی آنکھیں نہ پھیر لے اور اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے..... تو اس کیلئے ضروری ہے کہ آج وہ خود بھی جس قدر ممکن ہو سکے اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے۔

اللہ رب العزت کے حضور انتہائی عاجزانہ دعاء و فریاد ہے کہ اے اللہ! تو اپنے خاص فضل و کرم سے ہمارے بچوں کو ہمارے لئے رحمت، نعمت اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔

آمین یا رب العالمین۔



### زوجین کے حقوق و فرائض:

معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے، اور افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر اور ان کی اچھی یا بری تربیت گھر میں ہوتی ہے، اور گھر اُس وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی دوسرے عورت رشتہ از دواج میں منسلک ہوتے ہیں، یعنی شوہر اور بیوی کے اس نئے رشتے کے وجود میں آنے پر ایک نئے گھر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

شوہر اور بیوی کے دلوں میں اگر خوفِ خدا کا جذبہ موجزن ہو، آپس میں اتفاق و اتحاد اور صبر و تحمل کا مظاہرہ ہو، دلوں میں ایک دوسرے کیلئے محبت اور عزت و احترام کا احساس ہو..... تو یہ گھر بفضلِ خدا جنت کا نمونہ ثابت ہوگا، یہ شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کیلئے نعمت، رحمت اور دکھ سکھ کے ساتھی ثابت ہوں گے، اور یہاں تربیت پانے والے ان کے بچے مستقبل میں کامیاب و خوش نصیب انسان ثابت ہوں گے، اپنے والدین کیلئے معاشرے کیلئے ملک و ملت کیلئے، بلکہ پوری انسانیت کیلئے ان کا وجود نافع و مفید ہوگا۔

لیکن اگر اس کے برعکس شوہر اور بیوی میں آئے دن تلخ کلامی ہوتی ہو، گھر میں ہمیشہ جنگ و جدال اور فتنہ و فساد کا ماحول رہتا ہو، نہ ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا خیال ہو، نہ ہی اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس ہو، اور نہ ہی بچوں کے مستقبل کی فکر ہو..... تو ایسا گھر یقیناً جہنم بن جائے گا اور وہاں تربیت پانے والے بچے زندگی کے ہر میدان میں اور ہر مرحلے میں ناکام و مراد ڈرے سہمے، خود اعتمادی سے محروم، احساسِ محرومی میں مبتلا، اور معاشرے کیلئے بے کار، بلکہ نقصان دہ ثابت ہوں گے، عین ممکن ہے کہ یہ بچے خود اپنے بچپن کے دور میں پیار و محبت، ہمدردی و شفقت سے ہمیشہ محرومی کے سبب اب بڑے ہو جانے کے

بعد بطور انتقام دوسروں کے ساتھ سنگ دلی، ظلم و زیادتی اور جبر و سفاکی پر اتر آئیں، اور رفتہ رفتہ جرائم کی دنیا کی اس بندگی میں جا پھنسیں جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور پھر زندگی بھر بدبختی کے ہاتھوں ٹھوکریں کھاتے کھاتے آخر کار ان کا آخری ٹھکانہ پھانسی کا پھندا ہوگا.....!!

آج دنیا کی مختلف جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں جو بد نصیب قیدی سسک رہے ہیں، یا جو سزائے موت کے انتظار میں اپنی آخری سانسیں گن رہے ہیں..... اگر کوئی صاحبِ دل ان سے جا کر پوچھے یا ان کی آپ بیتی سنے تو یقیناً یہی بات سامنے آئے گی کہ بچپن میں گھر میں ماں باپ کے درمیان ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا، مار پٹائی اور لعن طعن کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا..... اُس خوفناک ماحول سے اور روز روز کی پٹائی کی اذیت سے بچنے کیلئے پہلے تو بچے گھر کے کونوں کھدروں میں، دروازوں کے پیچھے اور پلنگوں کے نیچے چھپے رہے، اور جب ذرہ بڑے ہوئے تو کنڈی کھول کر باہر نکل گئے..... اور بس یہیں سے بربادی و بدبختی کی ایک دردناک داستان اور اذیت ناک کہانی شروع ہو گئی، کیونکہ بچہ جب ایک بار گھر سے نکل گیا تو اب اسے زندگی بھر کبھی اپنے اُس گھر کی طرف واپسی نصیب نہیں ہو سکے گی..... الا ماشاء اللہ!

اور پھر گھر سے باہر بھی زندگی بھر وہ کبھی سکون سے نہ جی سکے گا، کیونکہ جس بد نصیب کو خود اپنے گھر کے آنگن میں اور اپنی ماں کے آنچل میں سکون نصیب نہ ہوا..... اسے دنیا میں اور کہاں سکون نصیب ہو سکے گا.....؟

لہذا میاں بیوی اگر یہ چاہتے ہوں کہ ان کا رشتہ قائم و دائم رہے، ان کا گھر آباد رہے اور جنت کا نمونہ بنا رہے..... اس گھر میں پرورش پانے والے ان کے معصوم بچے مستقبل میں



کامیاب انسان ثابت ہوں، اور در بدر ہونے سے محفوظ رہیں ..... تو انہیں اپنے اس ازدواجی رشتے کی بنیاد ایمان پر اور خوفِ خدا پر رکھنا ہوگی، باہمی اتفاق و اتحاد اور صبر و تحمل کو اپنا شیوہ و شعار بنانا ہوگا، جھوٹی انا اور مصنوعی شان سے دامن بچانا ہوگا، بلاوجہ ہٹ دھرمی اور ضد بازی سے مکمل گریز کرنا ہوگا، زندگی کے ہر معاملے میں عموماً اور باہمی رویہ و سلوک میں خصوصاً ہمہ وقت اپنے خالق و مالک کے سامنے اپنے ہر قول و فعل کی جواب دہی کا جذبہ بیدار رکھنا ہوگا، اور یہ احساس ہمیشہ تازہ رکھنا ہوگا کہ ان کا یہ مقدس رشتہ تو اللہ کا نام لے کر اور اُس کا کلام پڑھ کر قائم کیا گیا ہے، لہذا یہ رشتہ تو اللہ کی طرف سے مقدس امانت ہے، اور ایک روز اللہ کے سامنے حاضر ہو کر اس کی اس امانت کے بارے میں حساب و کتاب پیش کرنا ہے۔

تقریباً یہی مفہوم تو اس قرآنی آیت کا بھی ہے جو عموماً خطبہ نکاح میں پڑھی جاتی ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (۱) ترجمہ: (اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں پیدا کیا ایک جان سے، اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی بچو، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے)۔

اس تمہید کے بعد مزید یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ اس رشتے کو پائیدار و مستحکم بنانے اور اسے

قائم و دائم رکھنے کیلئے شوہر اور بیوی میں سے ہر ایک کو اس بارے میں اسلامی آداب و اخلاق، نیز ان حقوق و فرائض کا علم ہونا چاہئے جو اس سلسلے میں اسلامی شریعت میں مقرر کئے گئے ہیں، ان اسلامی آداب و اخلاق سے آگاہی اور ان کی پابندی، نیز ان حقوق و فرائض کی مکمل اور مخلصانہ طور پر ادائیگی میں ہی شوہر اور بیوی کی صلاح و فلاح اور ان کے اس مقدس رشتے کی پائیداری و استحکام کا راز پوشیدہ ہے۔  
اس سلسلے میں مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

### شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق:

اسلامی تعلیمات کی رو سے شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق دو قسم کے ہیں:

(۱) مادی (یا: مالی) حقوق (۲) معنوی حقوق۔

### (۱) مادی حقوق:

☆ مہر: اس مقدس رشتے کی ابتداء میں ہی عورت کی عزت و تکریم کے طور پر شوہر کیلئے ”مہر“ کی ادائیگی ضروری ہے، تاکہ اس طرح بیوی کی دلجوئی ہو سکے اور اسے شوہر کے دل میں اپنی قدر و منزلت کا خوشگوار احساس ہو۔

نیز عورت کی مزید عزت افزائی کی غرض سے اس مہر کو خالصہٴ عورت کا ذاتی حق اور اس کی ملکیت قرار دیا گیا، لہذا اس پر صرف عورت ہی کا حق ہوگا اور یہ صرف اسی کے قبضہٴ تصرف میں رہے گا، اس کے والدین، اس کے شوہر یا اور کسی کو اس میں ذرہ برابر تصرف کی قطعاً اجازت نہیں۔

شوہر کیلئے شرعاً اس مہر کی ادائیگی لازمی ہے، اس معاملے میں کسی قسم کی ٹال مٹول یا حیلے بہانے بنانے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے۔

البتہ اگر بیوی مکمل مہر یا اس کے کچھ حصہ کی ادائیگی میں برضا و رغبت کچھ مہلت دینے پر آمادہ ہو جائے تو ایسے میں مہر کی اس طے شدہ مقدار کو ”مؤجل“ کر دینے کا شرعاً جواز ہے۔ اسی طرح اگر بیوی کسی دباؤ یا جبر کے بغیر خالصہ اپنی خوشی و رضامندی کے ساتھ حق مہر یا اس کے کچھ حصہ سے دستبردار ہو جائے تو شوہر کیلئے اس سے استفادہ درست ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُنَّ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا﴾ (۱) ترجمہ: (عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو، ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھاؤ پیو) ☆ بنیادی ضروریات کی فراہمی:

شوہر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کیلئے اپنی حیثیت اور گنجائش کے مطابق بنیادی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرے، مثلاً: نفقہ اور سکنی (یعنی قیام و طعام) نیز لباس اور علاج وغیرہ۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِمَّا كُنْتُمْ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وَجْدِكُمْ﴾ (۲) ترجمہ: (تم اپنی طاقت کے مطابق جہاں تم رہتے ہو وہاں ان [بیویوں] کو بھی رکھو) نیز ارشاد ہے: ﴿لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ ، وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ﴾ (۳) ترجمہ: (کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہئے، اور جس پر اس کے رزق کی تنگی کی گئی ہو اسے چاہئے کہ جو کچھ اسے اللہ نے دے رکھا ہے اسی میں سے [حسب حیثیت] خرچ کرے)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) (۴)

ترجمہ: (اور تمہارے ذمے ہے اُن کا کھانا اور لباس، بہتر طریقے سے) (۱)

## (۲) معنوی حقوق:

☆ حسن معاشرت: معنوی حقوق میں اہم ترین چیز ”حسن معاشرت“ ہے۔ یعنی بیوی

کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک اور شریفانہ برتاؤ رکھا جائے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (۲) ترجمہ: (تم

ان [بیویوں] کے ساتھ گزران کرو اچھے طریقے سے) (۳)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ) (۴) ترجمہ: (تم میں سے

بہترین شخص وہ ہے جس کا اپنے گھر والوں کے ساتھ سلوک اچھا ہو)

نیز ارشاد نبویؐ ہے: (اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا) (۵) ترجمہ: (عورتوں کے ساتھ

حسن سلوک کے بارے میں تم میری وصیت قبول کرو)

اسی طرح ارشاد ہے: (فَاتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللَّهِ

وَأَسْتَحَلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللَّهِ) (۶) ترجمہ: (عورتوں کے ساتھ سلوک کے

بارے میں تم اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ تم نے انہیں حاصل کیا ہے اللہ کی امانت کے طور پر،

اور تم نے انہیں اپنے لئے جائز و حلال بنایا ہے اللہ کے نام پر)۔

(۱) یعنی شوہر کسی مال مثول اور حیلے بہانے کے بغیر عمدہ اور شریفانہ طریقے سے بیوی کو کھانا اور لباس مہیا کرے۔

(۲) النساء [۱۹]

(۳) غور طلب بات ہے کہ وہ معاشرہ جہاں عورت کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں تھی، اور جہاں بیٹیوں کو زندہ

دروگر کر دیا جاتا تھا وہاں قرآن کریم میں عورت کے ساتھ حسن سلوک کا یہ تاکید دیا گیا۔

(۴) ترمذی [۳۸۹۵] (۵) بخاری [۵۱۸۵] کتاب النکاح، باب الوصاة بالنساء (کتاب: ۶۷، باب: ۸۰)

(۶) مسلم [۱۲۱۸] باب حجة النبي ﷺ۔

شوہر اور بیوی کے اس مقدس رشتے کو تلخیوں اور رنجشوں سے پاک اور مستحکم و پائیدار بنانے کی غرض سے قرآن و حدیث میں ایک زریں اصول یہ بتایا گیا ہے کہ بیوی کی محض خامیوں پر ہی نظر نہ رکھی جائے بلکہ اس کی خوبیوں کو بھی دیکھا جائے، ان خوبیوں پر اس کی قدر دانی کی جائے، کیونکہ یہ بات تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی انسان میں صرف خامیاں یا صرف خوبیاں ہوں، ہر انسان میں خامیاں اور خوبیاں دونوں ہی چیزیں موجود ہوا کرتی ہیں، یہی قانونِ قدرت ہے، لہذا ہمیشہ بیوی کے عیوب و نقائص اور اس کی خامیوں پر ہی نظر رکھنے اور اسے لعن طعن کرنے کی بجائے اس کے محاسن کو بھی تلاش کیا جائے، اس کی خوبیوں پر اس کی تعریف کی جائے اور خوشی کا اظہار کیا جائے، تاکہ اس نازک رشتے میں کدورت و رنجش کی بجائے خوشگوار و آسودگی پیدا ہو سکے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَ يَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (۱) ترجمہ: (اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو جبکہ اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت ہی بھلائی رکھی ہو)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (لَا يَفْرَكُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً ، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ) (۲) ترجمہ: (کوئی مؤمن [شوہر] اپنی مؤمنہ [بیوی] کو ناپسند نہ کرے، کیونکہ اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناپسند ہو تو یقیناً اس میں کوئی ایسی عادت بھی موجود ہوگی جو اسے پسند ہو)

لہذا شوہر اپنی بیوی کو محض وقتی تفریح کا ذریعہ تصور نہ کرے، نہ ہی اسے محض سامانِ زینت سمجھے کہ جس کی کسی معمولی خامی یا کمزوری کی وجہ سے گویا اس کے گھر کی زینت و آرائش میں

کوئی نقص پیدا ہو جائے گا، بلکہ اسے چاہئے کہ وہ بیوی کو بھی خود اپنی طرح انسان ہی تصور کرے، اور اس اٹل حقیقت کو خوب ذہن نشین رکھے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں جو ہر عیب سے خالی ہو۔

### بیوی کے ذمے شوہر کے حقوق:

☆ اطاعت و فرمانبرداری:

بیوی کے ذمے شوہر کے حقوق کے ضمن میں سب سے اہم ترین چیز شوہر کی اطاعت گزاری، فرمانبرداری اور وفا شعاری ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ، فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ﴾ (۱) ترجمہ: (مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں، پس نیک عورتیں فرمانبرداری کرنے والیاں ہیں، خاوند کی غیر موجودگی میں بحفاظتِ الہی نگہداشت رکھنے والیاں ہیں) اس آیت سے صراحتہً مرد کی ”قوامیت“، یعنی اپنے گھر میں اس کی ”حکمرانی“ ثابت ہوتی ہے۔

لیکن اس ”قوامیت“ سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ مرد اپنے گھر میں مطلق العنان حکمران اور ہر سیاہ و سفید کا مالک بنارہے، اور یہ کہ بس ہر وقت ڈنڈا اٹھائے ہوئے دندناتا ہی پھرا کرے.....!

بلکہ اس قوامیت سے مراد یہ ہے کہ گھر کے انتظامی امور میں اس کی رائے کو اور اسی کی مرضی

کونوقیت حاصل ہوگی، ساتھ ہی اس فوقیت کی دو وجوہات بھی بیان کر دی گئیں، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ: ”بما فضل اللہ بعضہم علی بعض“، یعنی اللہ نے ہی مرد و عورت میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمادی ہے، اور اسی فضیلت میں ہی یقیناً یہ بات بھی شامل ہے کہ مرد و عورت دونوں کی جسمانی ساخت اور ذہنی کیفیات کو مد نظر رکھتے ہوئے انتظامی امور چلانے کیلئے مطلوبہ ہمت و طاقت قدرتی اور فطری طور پر مرد کو ہی عطا کی گئی ہے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی گئی: ”و بما انفقوا من اموالہم“، یعنی: ”مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں“۔

درحقیقت انسانوں کے خالق و مالک کو اپنے پیدا کردہ انسان کی فطرت و طبیعت اور اس کی پیدائشی و قدرتی صلاحیتوں کے بارے میں خوب علم ہے، اور وہ خود انسان سے بھی بڑھ کر اس بات سے واقف ہے کہ انسانوں میں سے کس کیلئے کیا چیز بہتر ہے اور کون کس ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھاسکتا ہے؟

چنانچہ اپنے اسی علم کامل کی بناء پر ہی اس علیم و خیر کا فیصلہ یہ ہے کہ مرد گھر سے باہر محنت و مشقت، بھاگ دوڑ، جدوجہد اور کسب معاش کی ذمہ داری اٹھائے، اور عورت امور خانہ داری اور بچوں کی تربیت و نگہداشت کا فریضہ انجام دے۔

☆..... گھر سے باہر محنت و مشقت کر کے گھر والوں کیلئے پیسہ کما کر لانا اور روزی روٹی کا انتظام کرنا جب مرد کی ذمہ داری قرار پائی ہے تو پھر انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ گھر میں اسی کی مرضی اور اسی کی رائے کو فوقیت بھی حاصل ہو، کیونکہ یہ تو بڑی ہی نا انصافی ہوگی کہ مرد دن بھر خون پسینہ بہا کر جن بیوی بچوں کی خاطر روپیہ پیسہ کماتا ہے، گھر واپس لوٹنے پر اپنے انہی بیوی بچوں کے سامنے ہی اس کی مرضی اور رائے کی کوئی اہمیت و وقعت نہ ہو، اور وہاں

مرضی ان لوگوں کی چلتی ہو جن کا پیٹ بھرنے کیلئے وہ شب و روز خود کو ہلکان اور نڈھال کئے رکھتا ہے.....!

☆..... اور پھر اس گھر کی تیاری اور اس میں موجود سامان اور مال و اسباب کی خریداری کیلئے تمام اخراجات کا انتظام بھی تو شوہر ہی کرتا ہے، لہذا اپنے اسی گھر میں ہی اگر شوہر کی بجائے کسی اور کی مرضی چلنے لگے تو یہ سراسر نا انصافی ہوگی۔

☆..... اس کے علاوہ یہ کہ شوہر اور بیوی کا یہ رشتہ قائم کرتے وقت ”مہر“ شوہر نے ادا کیا، دیگر تمام مالی اخراجات بھی اسی کے ذمے رہے، لہذا اب انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اسی کی مرضی اور رائے مقدم رہے۔

اس کے بعد مذکورہ آیت: ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ.....﴾ میں نیک عورتوں کی صفات کے بیان میں یہ بات ذکر کی گئی کہ وہ ”فرمانبرداری کرنے والیاں ہیں“، یعنی اللہ کی بھی فرمانبرداری، اور اپنے شوہر کی بھی فرمانبرداری۔ نیز یہ کہ وہ ”شوہر کی غیر موجودگی میں حفاظت کرنے والیاں ہیں“، یعنی عفت و عصمت کی حفاظت، شوہر کی عزت کی حفاظت، اس کے گھر کی حفاظت، اس کے مال و اسباب کی حفاظت، اور اس کے بچوں کی حفاظت۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَفِظَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ زَوْجَهَا قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الْجَنَّةَ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتَ) (۱) ترجمہ: (عورت اگر پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی عفت و عصمت کو محفوظ رکھے، اور اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کرتی رہے، تو اسے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ: ”جنت کے جس دروازے سے چاہو تم جنت میں



داخل ہو جاؤ“۔)

نیز ارشاد ہے: (أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا رَاضٍ عَنْهَا دَخَلَتْ الْجَنَّةَ) (۱)  
ترجمہ: (جس عورت کی موت اس حالت میں واقع ہوئی کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو، وہ  
جنت میں داخل ہو جائے گی)

نیز ارشاد نبویؐ ہے: (لَوْ كُنْتُ أَمْرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ  
تَسْجُدَ لَزَوْجِهَا) (۲) ترجمہ: (اگر [اللہ کے سوا] کسی کیلئے سجدہ جائز ہوتا تو میں عورت  
کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے)

شریف، نیک، پارسا و پرہیزگار اور اطاعت گزار و فرمانبردار عورت کی اعلیٰ قدر و منزلت  
اور بلند رتبہ و مقام کے بارے میں خاتم الانبیاء والمرسلین، سید الاولین والآخرین علیہ افضل  
الصلاة و اتم التسليم کی یہ معروف حدیث ملاحظہ ہو جس میں آپ ﷺ نے نیک و صالحہ  
عورت کو دنیا کی سب سے بہترین نعمت اور قیمتی ترین سرمایہ قرار دیا ہے، ارشاد نبویؐ ہے:  
(خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا: الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ) (۳) ترجمہ: (دنیا کی سب سے بہترین  
نعمت ”نیک عورت“ ہے)۔



(۱) ترمذی [۱۱۶۱]

(۲) ترمذی [۱۱۵۹] باب ما جاء في حق الزوج على المرأة۔

(۳) مسلم [۱۴۶۷] باب ”خير متاع الدنيا المرأة الصالحة“۔

### قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک:

دین اسلام میں انسان کو اپنے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، ان کی عزت و تکریم، خدمت و خبر گیری، دکھ سکھ میں شرکت، اور بوقت ضرورت ان کی ہر ممکن مالی و اخلاقی مدد و اعانت کی بہت زیادہ تاکید و تلقین کی گئی ہے، اور اس چیز کو دنیا و آخرت میں باعث خیر و برکت اور سعادت مندی کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

جبکہ اس کے برعکس قرابت داروں کے ساتھ بدسلوکی، قطع رحمی، اور ان کی حق تلفی کو انسان کیلئے موجب لعنت و نحوست، عمر میں کمی اور رزق میں تنگی و بے برکتی کا سبب بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اسی چیز کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی ہے، ارشادِ بانی ہے: ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (۱) ترجمہ: (اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناٹے توڑنے سے بھی بچو، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّةً﴾ (۲) ترجمہ: (قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿.....وَأَتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ.....﴾ (۳) ترجمہ: (.....اور یہ کہ مال کی محبت کے باوجود جو کوئی اپنے مال میں سے دیتا رہا قرابت داروں کو.....)

اسی طرح قرآن کریم میں اہل ایمان کی صفات کے تذکرہ میں ان کی ایک یہ صفت بھی بیان

کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور اللہ نے جن چیزوں کو جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے وہ انہیں جوڑتے ہیں)

نیز ارشاد ہے: ﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتَقَطُّوا أَرْحَامَكُمْ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ﴾ (۲) ترجمہ: (اور تم سے یہ بھی بعید نہیں کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم زمین میں فساد برپا کر دو اور رشتے ناتے توڑ ڈالو، یہی تو وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جنہیں بہرا بنادیا ہے اور آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُمَدَّ لَهُ فِي عُمْرِهِ وَيَزَادَ فِي رِزْقِهِ فَلْيَبَرَّ وَالِدَيْهِ وَلْيَصِلْ رَحِمَهُ) (۳) ترجمہ: (جس کسی کی یہ خواہش ہو کہ اس کی عمر طویل ہو اور اس کے رزق میں اضافہ ہو، اسے چاہئے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک اور رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے)

قربت داروں میں سے مستحق محتاج افراد کی خبر گیری اور ان کی مدد و اعانت پر دھرے اجر و ثواب کی خوشخبری دی گئی ہے، ایک ثواب صدقہ و خیرات کا، اور دوسرا ثواب صلہ رحمی کا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الصَّدَقَةُ عَلَى الْمَسْكِينِ صَدَقَةٌ، وَعَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ : صَدَقَةٌ وَصَلَةٌ) (۴) ترجمہ: (کسی مسکین کو صدقہ دینا تو محض صدقہ ہی ہے، جبکہ کسی رشتے دار کو صدقہ دینے میں دونکیاں ہیں، یعنی ”صدقہ“ اور ”صلہ رحمی“۔)

☆..... جبکہ اس کے برعکس ”قطع رحمی“، یعنی قربت داروں سے قطع تعلق، ان کے ساتھ

(۱) الرعد [۲۱] یعنی رشتوں اور قریاتوں کو توڑتے نہیں، بلکہ انہیں جوڑے رکھتے ہیں، یعنی صلہ رحمی کرتے ہیں۔

(۲) محمد [۲۳] احمد [۱۳۴۲۵]

(۳) ترمذی [۶۵۸] باب ماجاء فی الصدقة علی ذی القرابة۔

بدسلوکی، یا کسی بھی شکل میں انہیں صدمہ، نقصان، اور اذیت پہنچانے کو اور ان کی دل آزاری کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے، اور اس چیز کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے، اس گناہ عظیم کی قباحت و شاعت کا، نیز اس معاملے کی انتہائی نزاکت کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے مرتکب شخص کیلئے آخرت میں گرفت اور عذاب کے ساتھ ساتھ مزید یہ کہ دنیا میں ہی فوری سزا اور تباہی و بربادی کی خبر دی گئی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعْجَلَ اللَّهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يُدْخِرُ لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْبَغْيِ وَقَطِيعَةِ الرَّجْمِ) (۱) ترجمہ: (کوئی گناہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے مرتکب شخص کو اللہ کی طرف سے آخرت میں سزا کے ساتھ دنیا میں ہی فوری سزا دی جاتی ہو، سوائے ظلم و زیادتی کے، اور قطع رحمی کے) یعنی ظلم و زیادتی و نا انصافی، اور اسی طرح قطع رحمی کا مرتکب انسان آخرت میں عذاب اور سزا بھگتنے سے قبل دنیا میں بھی اللہ کی طرف سے سزا بھگتے گا، کامیابیوں کے تمام تر اسباب و وسائل کی فراہمی و فراوانی کے باوجود ناکامی، زوال و انحطاط، اور تباہی و بربادی اس کا مقدر بنے گی، یہی قانون قدرت ہے، جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو دنیا و آخرت کی بربادی سے محفوظ و مأمون رکھیں۔



(۱) ترمذی [۲۵۱۱] باب: ۵۷ من أبواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔

نیز: بخاری فی اللہ [۶۷] باب عقوبۃ قاطع الرحم فی الدنیا۔ (باب نمبر: ۳۳)

## پڑوسی کا احترام:

دین اسلام کی تعلیمات و ہدایات کی روشنی میں ہر انسان کیلئے سب ہی کے ساتھ عزت و احترام کا برتاؤ رکھنا، ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی و خندہ پیشانی سے پیش آنا اور کسی بھی قسم کی بدسلوکی، اذیت رسانی اور نقصان پہنچانے سے باز رہنا ضروری ہے۔

البتہ چونکہ کسی بھی انسان کی خوش اخلاقی یا بد اخلاقی سے دیگر عام انسانوں کی نسبت اس کے پڑوسی براہ راست متاثر ہوتے ہیں، اس لئے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی کی خاص تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾ (۱) ترجمہ: (اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ سلوک و احسان کرو، اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور قرابت دار ہمسایہ سے اور اجنبی ہمسایہ سے اور پہلو کے ساتھی سے اور مسافر سے اور ان سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا)

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی کہ پڑوسیوں کے تین درجات و مراتب ہیں: سب سے پہلا درجہ ہے: وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ یعنی وہ پڑوسی جس کے ساتھ رشتہ

داری کا تعلق بھی ہو، اس پڑوسی کے ساتھ دوسرا تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا مقام و رتبہ اور اس کا حق بھی زیادہ ہے، لہذا اس کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت بھی زیادہ ہے۔  
دوسرا درجہ ہے: وَالْجَارِ الْجُنُبِ یعنی محض برابر میں رہنے والا یا ہمسایہ یعنی وہ شخص جو صرف پڑوسی ہے اور اس کے ساتھ رشتہ داری کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک ضروری ہے، اگرچہ وہ غیر مسلم ہو۔

تیسرا درجہ ہے: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ یعنی وہ شخص جو مختصر مدت کیلئے اور محض تھوڑی سی دیر کیلئے قرب و جوار میں موجود ہو، مثلاً ہم جماعت افراد، ہم پیشہ لوگ، دفتر کے ساتھی، یا کسی مسافر خانے میں، ہوائی جہاز میں، ریل میں یا بس میں آس پاس موجود لوگ، یا کسی جگہ قطار میں لگے ہوئے کچھ لوگ جو ساتھ ساتھ کھڑے ہوں، اگرچہ باہم ایک دوسرے کیلئے وہ سب اجنبی ہوں، نہ کسی کا نام معلوم ہو، نہ یہ علم ہو کہ ان میں سے کس کا کیا مذہب ہے؟ کس ملک یا کس علاقے سے تعلق ہے.....؟ مگر مذکورہ بالا آیت کی رو سے وہ سب بھی باہم ایک دوسرے کیلئے ”پڑوسی“ ہیں اور ان کیلئے آپس میں حسن سلوک اور عزت و احترام کا رویہ رکھنا نیز باہم بدسلوکی و ایذا رسانی سے باز رہنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ (۱) ترجمہ: (جو کوئی اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے)

نیز ارشاد ہے: (وَاللَّهُ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللَّهُ لَا يُؤْمِنُ ، قِيلَ : مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ : الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارَهُ بَوَاقِهِ) (۲) ترجمہ: (اللہ کی قسم وہ

شخص مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ شخص مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ شخص مومن نہیں، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون شخص ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”وہ شخص جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے محفوظ نہوں۔“

اسی طرح ایک بار رسول اللہ ﷺ کے سامنے کسی عورت کے بارے میں یہ تذکرہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ نفل نماز روزہ اور صدقہ و خیرات وغیرہ کا اہتمام و التزام کرتی ہے، مگر یہ کہ اس کے پڑوسی اس کی تلخ کلامی اور زبان درازی کی وجہ سے بہت بیزار رہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: **هِيَ فِي النَّارِ** یعنی: ”اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔“

اس کے بعد کسی عورت کے بارے میں یہ تذکرہ ہوا کہ وہ نفل عبادات کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی مگر یہ کہ اس کے پڑوسی اس کے حسن سلوک کی وجہ سے آسودہ و مطمئن ہیں، آپؐ نے فرمایا: **هِيَ فِي الْجَنَّةِ** یعنی: ”یہ عورت جنت میں جائے گی۔“ (۱)

اسی طرح ارشاد ہے: **(مَا آمَنَ بِي مَن بَاتَ شَبَعَانِ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ وَهُوَ يَعْلَمُ)** (۲) ترجمہ: (اس شخص نے مجھ پر ایمان قبول نہیں کیا جو رات کو پیٹ بھر کر سو جائے، حالانکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو، اور اسے اس بات کا علم بھی ہو)۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ،**

**سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ،**

**وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.**

(۱) احمد [۹۶۷۳]

(۲) مجمع الزوائد جلد: ۱ صفحہ: ۱۶۷ بحوالہ: الطبرانی والہو ار۔ نیز: بخاری فی الأدب المفرد [۱۱۲] بعض روایات میں ”ما آمن بی“ کی بجائے ”لیس منا“ اور ”الی جہنم“ کی بجائے ”الی جہنم“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

